شام کا بحران

ڈاکٹر حمزہ ابراہیم

فہرست

باب اول: تعارف...3

باب دوم: مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کا قیام 7

باب سوم: بشار الاسد اور مشرق وسطیٰ...17

باب چہارم: عرب بہار کا پس منظر...21

باب پنجم: شام اور عراق کی تقسیم کی سازش 26

باب ششم: شام میں آگ اور خون...30

باب ہفتم: شام کی جنگ میں کون کیا ہے؟...38

باب ہشتم: فتنہ خوارج (قرآن وحدیث کی روشنی میں)...43

باب نہم: عرب بہار اور مشرق وسطیٰ کے شیعہ 48

باب دہم: پاکستان کو درپیش خطرات 56

باب اول: تعارف

اپریل 2017 میں لیاقت میڈیکل یونیورسٹی کی طالبہ اور ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانے سے تعلق رکھنے والی لڑکی کی لاہور سے گرفتاری کی خبر نے پورے ملک کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ نورین نامی اس سادہ لڑکی نے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر ایک دہشتگرد سے شادی کر لی اور گھر والوں کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ شام جا چکی ہے۔ وہ اپنے نئے نویلے دولہا کے ساتھ بقیہ زندگی گزارنے کی بجائے لاہور میں مسیحی حضرات کی مذہبی تقریب میں دھماکہ کرنا چاہ رہی تھی کہ خفیہ اداروں کے آپریشن میں گرفتار ہو گئی۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس سوال کا جواب جاننے کیلئے ہمیں ایسے طلبہ کے ذہنی پس منظر کو سمجھنا ہو گا اور اس فکری آلودگی کو سنجیدگی سے لینا ہو گا جس کا انہیں سامنا ہے۔ ہمارے معاشرے میں جو لکھاری حالاتِ حاضرہ اور تاریخ سے سروکار رکھتے ہیں، ان میں سے اکثر برصغیر کو درپیش مسائل پر لکھتے ہیں کیوں کہ ان مسائل کا ہماری زندگی سے قریبی تعلق ہے۔ ان صاحبانِ علم نے مشرقِ وسطیٰ کو کبھی ترجیحات میں نہیں رکھا۔ اکیسویں صدی میں انفارمیشن ٹیکنالوجی نے حالات کو بدل دیا ہے۔ اب مشرقِ وسطیٰ سے ہمارے عوام کا ذہنی تعلق اتنا ہی اہم بن گیا ہے جتنا برصغیر سے ہمارا امادی تعلق اہم ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کے حالات کے بارے میں نہ لکھنے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہمارے وہ بچے جو سائنس یا معاشیات کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور جن کے پاس تاریخ کے حقائق اور بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں علم حاصل کرنے کا وقت نہیں ہے، وہ مذہبی تنظیموں کا آسان شکار بنیں گے۔ محض یہ کہنا کہ یہ لوگ حوروں سے جنسی اختلاط کی لالچ میں ایسا کر رہے ہیں، اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے۔ مسئلہ اتنا سادہ نہیں ہے۔ یہ لوگ دنیاوی لذتوں کی بجائے انسانیت اور اسلام کیلئے قربانی دینے کے نام پر یہ سب کر رہے ہیں۔ ان کو بیوقوف بنا کر استعمال کیا جا رہا ہے۔ مذہبی تنظیموں کی طرف سے روزانہ سینکڑوں صفحات پر مبنی جھوٹ سوشل میڈیا کے ذریعے پھیلایا جاتا ہے۔ اس سیلاب کا مقابلہ ٹھوس حقائق کو نشر کر کے ہی کیا جا سکتا ہے۔ شام کا بحران آج کل مشرقِ وسطیٰ اور اسلامی دنیا کا اہم ترین موضوع ہے۔ اگرچہ ہمارے الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا میں شام کے حالات کے بارے میں زیادہ تجزیات شائع نہیں ہوتے۔ لیکن جب کبھی اس حوالے سے کوئی بات سامنے آتی ہے تو وہ اکثر بی بی سی جیسے ذرائع ابلاغ کا چربہ ہوتی ہے جو مشرقِ وسطیٰ میں کبھی غیر جانبدار نہیں رہے۔

سچ تک رسائی انسان کا بنیادی حق ہے۔ مسلمان معاشروں میں سائنس اور معاشیات جیسے مضامین کے طلبہ کا دہشتگردی جیسی حماقت میں مبتلا ہونا تاریخی حقائق کو نہ جاننے کی وجہ سے ہے۔ ہمارے مذہب میں بھی جھوٹ کو بہت بڑا گناہ اور تمام برائیوں کی جڑ کہا گیا ہے۔ سچ تک رسائی اس لیے ضروری ہے تاکہ وہ لوگ جو صاف نیت رکھتے ہیں، محض اس وجہ سے غلط فیصلے نہ کریں کہ انھیں صورتِ حال کا صحیح ادراک نہیں تھا۔ اسی حق سے میڈیا اور سوشل میڈیا کی آزادی کا حق

جنم لیتا ہے۔ اگر میڈیا آزاد ہو گا تو جہاں یہ ممکن ہے کہ بااثر لوگ یا طاقتیں اپنے مفادات کیلئے جھوٹ یا آدھا سچ پیش کریں، وہیں یہ بھی ممکن ہے کہ دوسرے میڈیا ذرائع سے کچھ باضمیر افراد پورا سچ بیان کریں۔ البتہ بدقسمتی سے مفاد پرست عالمی اسلحہ فروش کمپنیوں اور مالیاتی اداروں کے مالکان نے میڈیا کو عوام کے ذہن سے کھیلنے اور اپنے مقاصد کیلئے راہ ہموار کرنے کا ذریعہ بنالیا ہے۔ شام کے بحران کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ اپنے ہم عصر سیاسی بحرانوں (یمن، بحرین، یوکرین، لیبیا، آزاواد، وغیرہ) کی نسبت کہیں زیادہ کیمرے اور میڈیا کی نظروں میں ہے۔ اسکی وجہ جہاں اسکی سیاسی اہمیت ہے وہیں اس کو ملنے والا فرقہ وارانہ رنگ بھی ہے۔

آجکل اوریا مقبول جان جیسوں کی طرف سے آخری زمانے کے حوالے سے پائی جانے والی احادیث کو زمانہ حاضر پر اپنے گروہی مفادات کے مطابق چپکایا جارہا ہے۔ قرآن کے مطابق جو لوگ متشابہات کی تفسیر محکمات کی روشنی میں نہیں کرتے، انکی نیتوں میں بیماری ہوتی ہے (سورہ آل عمران، آیت 7)۔ آخری زمانے کے بارے میں آنے والی احادیث میں تشبیہات استعمال ہوئی ہیں کیونکہ مستقبل کی واضح منظر کشی کبھی بھی ممکن نہیں ہوتی۔ ان تشبیہات کے صحیح مصادیق کا تعین محکم حقائق اور فلسطین و لبنان کی آزادی کی جدوجہد جیسے واضح مسائل کے بارے میں موجود محکم قرانی احکامات (مثلا سورہ الحج، آیت 40) کو مد نظر رکھے بغیر ممکن نہیں۔

ہمارے معاشرے کے متعصب لکھاری عالم اسلام میں لمبے عرصے سے جاری تنازعات کے بارے میں سیاسی اور تاریخی حقائق کو سامنے لانے کے بجائے اپنے تخیل کی مدد سے ایسا منظر نامہ تشکیل دینے کی کوشش کرتے رہتے ہیں جو ان کے تعصبات سے ہم آہنگ ہو۔ جس وقت داعش عراق میں فرقہ وارانہ قتل و غارت کر رہی تھی اس وقت یہ لوگ کالے جھنڈوں والی احادیث سنا کر ان کو داعش پر لاگو کر رہے تھے۔ یہ سلسلہ تب رکا جب داعش نے مغربی ممالک میں بھی اپنی بربریت کو منتقل کرنا شروع کیا۔ اس سے پہلے یہی لوگ خراسان نامی ایرانی صوبے کے بارے میں ملنے والی احادیث کو قندھار اور جنوبی پنجاب پر منطبق کرتے رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر تیسرے طالبان امیر نے اپنے نام کے ساتھ خراسانی لگا رکھا ہے۔ طالبان کے بارے میں ان کی پیش گوئیوں کا سلسلہ اس وقت رکا جب ان لوگوں نے آرمی پبلک اسکول میں معصوم بچوں کے خون سے ہولی کھیلی اور عوام کا ضمیر لرز کر رہ گیا۔

شام کے بحران کے حوالے سے اپنے تعصبات کے زیر اثر آکر جو جھوٹ اور نفرت پاکستان میں پھیلائی جا رہی ہے اس کا شام کی خانہ جنگی پر تو کوئی قابل ذکر اثر نہیں پڑے گا لیکن یہاں کے معصوم بچوں کے ذہن ضرور گمراہ ہوں گے۔ وہ اپنے ملک میں رہنے والے دوسرے مسالک و مذاہب کے لوگوں کے بارے میں تعصب اور غلط فہمیوں کا شکار ہو جائیں گے۔

اعلیٰ تعلیمی اداروں کے مذہبی طلبہ میں دہشتگردی کی طرف رجحان کی وجہ پاکستانی میڈیا اور سوشل میڈیا پر خارجی تنظیموں کی پردہ پوشی ہے۔

اس نکتے کی مزید وضاحت کیلئے ایک مثال عرض ہے: اگر کربلا کے واقعے میں کسی نے یزید کو بے گناہ ثابت کرنا ہے تو اس کو کربلا سے پہلے اور اس کے بعد کے واقعات کو چھپانا پڑے گا۔ اگر کربلا کو تاریخی سیاق و سباق میں رکھ کر دیکھا جائے تو سچ پر پردہ ڈالنا ممکن نہیں رہتا۔ کربلا سے پہلے یزید کا مدینہ کے گورنر کو خط اور نواسۂ رسولؐ کا بیعت سے انکار۔ مصر سے آزار بائیجان اور ترکی سے یمن تک پھیلی امت مسلمہ کا یزید کی بیعت کر لینا اور صرف کوفہ کے باسیوں کا امام کی حمایت کا وعدہ کرنا۔ امام عالی مقام کا کوفہ والوں کی بزدلی سے واقف ہونا اور مکہ میں کئی ماہ قیام کر کے امت کے سرکردہ افراد سے رابطے کرنا اور انھیں خاموش رہنے سے روکنا۔ مکہ سے کوفہ کی طرف ہجرت اور کوفہ والوں کی بے وفائی کے باوجود آپ کا بیعت سے انکار، آپ کی شہادت کے بعد یزید کا مدینہ میں حرہ کا قتل عام، اور بعد میں مکہ پر لشکر کشی۔ یہ سب حقائق اکٹھے ہو کر ہی کربلا کی صحیح تصویر کو سامنے لاتے ہیں۔ امام کو اپنی اور اپنے اہل و عیال کی زندگی کو درپیش خطرات اور تاریخی غلطی میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا، آپ نے یزید کی بیعت کا تاریخی گناہ نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ آپ کے اسی فیصلے کی بدولت آج مسلمانوں کے پاس ایک مثال موجود ہے کہ جب معاشرہ دہشت زدہ ہو جائے تو کیا کرنا چاہیئے؟

موجودہ زمانے میں خلافت کے نام سے اٹھنے والی تحریکوں کے طرز عمل کو تاریخ کی روشنی میں دیکھنے کے لیے حضرت عمرؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ الشریف کے زمانہ حکومت کا مطالعہ بھی لازمی ہے، جس کی طرف ہم نے اس کتاب کے صفحہ 41 پر اشارہ کیا ہے۔ تاہم چونکہ زمانہ حال پر سب سے زیادہ اثر ماضی قریب کا ہوتا ہے اس لیے اس کتاب میں بیشتر وقت قدیم تاریخ کے بجائے ماضی قریب کی تاریخ کو بیان کرنے پر صرف کیا گیا ہے۔

تاریخ قوم کا حافظہ ہوتی ہے۔ جو قوم تاریخ کو اہمیت نہ دے اس کی مثال ایسے شخص کی ہے جو اپنی یاداشت کھو بیٹھا ہو۔ اس کو بیوقوف بنانا آسان ہو جاتا ہے۔ شام کے حوالے سے جو احادیث آئی ہیں ان کی روشنی میں حق کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرنے کے لیے شام میں موجود فریقین کی تاریخ کو جاننا ہو گا۔ کیا شامی فوج حق کا لشکر ہے یا القاعدہ؟ احادیث میں کسی کا نام نہیں ملے گا۔ لہٰذا ان احادیث کے مصادیق کا تعین محکم حقائق کو سامنے رکھے بغیر ممکن نہیں۔ داعش میں کئی انجنیئرز اور ڈاکٹرز شامل ہیں۔ ہم آج تک یہی سنتے آئے ہیں کہ مسلمان معاشروں کی پسماندگی کی وجہ سائنس سے دوری ہے لیکن اس طرح ہم دوسرے علوم کی نسبت غفلت برتتے رہے ہیں۔ جہاں معاشرے کی مادی ضرورتوں کو سائنس نے پورا کیا ہے وہاں معاشرے کے رخ کو متعین کرنے میں تاریخ کے صحیح شعور کی کمی نے ہم سے بہت غلطیاں کروائی ہیں۔ ہم نے بہترین ڈاکٹر، انجنیئر اور سائنس دان تو پیدا کیے ہیں لیکن عالمی معیار کے تاریخ دان پیدا نہیں کیے۔ تاریخ کی تعلیم اور اس

کا تجزیہ ہی ہمیں اپنے سے پہلے گزرنے والے انسانوں کے تجربات سے سیکھنے اور ان کی غلطیاں نہ دھرانے کے قابل بناتا ہے۔ فلسفے کی ایک تعریف یہ ہے کہ فلسفہ تاریخ کو سمجھنے کا علم ہے۔ تاریخ سے نابلد انسان دراصل ذہنی طور پر ما قبل از تاریخ زمانے میں رہتا ہے۔ ایسے انسان کیلئے جدید سائنس سے آشنائی صرف نئے اوزار اور نیا لباس فراہم کرنے کے کام آتی ہے۔ وہ وحشی انسانوں کی طرح لڑتا جھگڑتا، خوف اور لالچ کی دیواروں کے بیچ قید رہتا ہے۔

ہمارے بچوں کو نہ سکول کے زمانے میں دنیا کی جدید تاریخ کا تعارف کروایا جاتا ہے نہ میڈیا پر جدید تاریخ سے آگاہی کا کوئی سلسلہ میسر ہے۔ دینی مدارس میں حالات بد تر ہیں۔ مذہبی تنظیموں کے مبلغ تعلیمی اداروں میں کینسر کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں نے ان نظریات میں بہت کچھ خرچ کیا ہے، اپنا وقت، اپنی امیدیں، اپنا مستقبل۔ ان کے لئے تاریخ کا سامنا کرنا ایک نہایت خوفناک تجربہ ہے، ان کے خوابوں کا شیش محل پاش پاش ہو سکتا ہے۔ ان کے نظریات تاریخ کی تجربہ گاہ میں پہلے سے رد ہو چکے ہیں۔ وہ تاریخ کا علم حاصل کرنے سے ان حسین خوابوں کو کھو دینے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے جنہیں وہ اپنی زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں میں اتنی جرات نہیں ہے کہ اتنے بڑے نفسیاتی بحران کا سامنا کر سکیں۔ یہ لوگ تاریخ کے علم کے خلاف سائنس سے بھی زیادہ مزاحمت کرتے ہیں۔ اگرچہ اپنے نظریات کیلئے چیدہ چیدہ مثالیں اور جواز بھی تاریخ سے ہی ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔ یہ لوگ تعلیمی اداروں میں حقائق کے منافی تبلیغ کر کے سائنس اور معاشیات جیسے مضامین کے طلبہ کو غیر حقیقی جنت کی طرف راغب کرتے ہیں جس کی حقیقت جیل کی کال کوٹھڑی میں جا کر ہی پوری طرح آشکار ہوتی ہے۔ جو لوگ تاریخ کی درسگاہ میں نہیں آتے وہ لوگ ہمیشہ کے لئے ناکام اور گمنام ہو جاتے ہیں۔ ان کے نظریات انہی عملی مشکلات کا شکار ہوتے ہیں جن کی تاریخ کی تجربہ گاہ نے پیش گوئی کی تھی۔

باب دوم: مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کا قیام

دنیا میں کوئی بھی واقعہ یکدم رونما نہیں ہوتا بلکہ اس کا تعلق ماضی کے واقعات یعنی تاریخ سے ہوتا ہے۔ شام کے حالات کو سمجھنے کیلئے اس علاقے کی حالیہ تاریخ کو جاننا بہت ضروری ہے۔ جس وقت عالمی طاقتوں نے جنگ عظیم دوم کی وجہ سے کمزور ہو جانے اور غلام بنائی گئی اقوام میں بڑھتی ہوئی آزادی کی تحریکوں کی وجہ سے مشرق وسطیٰ سے نکلنا چاہا تو ان کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ ایشیا اور افریقہ کے معدنی وسائل کی مغربی دنیا کے صنعتی ممالک میں ترسیل کو کیسے محفوظ بنایا جائے؟ جدید صنعت اور معیشت کیلئے درکار توانائی مشرق وسطیٰ کے تیل اور خام مال کی ضروریات افریقہ اور برصغیر کی معدنیات اور زراعت سے پوری ہوتی تھیں اور یہ چیزیں مصر کی نہر سویز اور فلسطین کے ساحل سمندر کے راستے مغربی منڈیوں میں پہنچتی تھیں۔ دوسری طرف پچھلے دو ہزار سال سے یورپ میں بسنے والے یہودی اپنے خلاف ہونے والے امتیازی سلوک کی وجہ سے اب فلسطین یا امریکا کی طرف ہجرت کرنے لگ گئے تھے۔

یورپ میں بسنے والے یہودیوں میں سے کچھ تو وہ تھے جن کے آباواجداد بنی اسرائیل کی نسل سے تعلق رکھتے تھے، یہ لوگ فلسطین پر رومیوں کے قبضے کے بعد یورپ پہنچے تھے۔ لیکن اکثر یہودیوں کا تعلق روسی نسل سے تھا جو اشکنازی کہلاتے تھے۔ اشکنازی یہودیوں کا تعلق بنی اسرائیل سے نہیں ہے۔ بلکہ یہ نیلی آنکھوں اور گوری رنگت والے لوگ دو ہزار سال پہلے یہودی مذہب اختیار کرنے والے ایک روسی قبیلے کی نسل سے ہیں جو موجودہ یوکرین اور روس کے کچھ علاقوں میں آباد تھا۔ ماضی بعید میں بنی اسرائیل کے یہودیوں کی اکثریت نے فلسطین میں رہتے ہوئے اسلام قبول کر لیا تھا۔ نہ صرف اسلام کا نظریہ توحید ان کے عقائد کے قریب تھا، بلکہ اسلام قبول کرنے والوں کو جزیہ بھی نہیں دینا پڑتا تھا۔ یورپ میں یہودیوں کو نہ صرف مذہبی اختلاف کی وجہ سے نفرت کا نشانہ بنایا جاتا تھا بلکہ نسل پرستی کی وجہ سے بھی انہیں امتیازی سلوک کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا۔ ہر حادثے یا ناکامی کو یہودیوں کی سازش کہا جاتا۔ اس نفرت کی وجہ سے بعض یہودیوں نے جنگ عظیم دوم سے پچاس سال قبل اپنے مذہب کی تعلیمات کے برعکس یہودی ریاست کے قیام کا خیال اپنایا۔ یہ لوگ صیہونی کہلاتے تھے اور مغربی اقوام کی طرف سے کینیڈا، امریکا اور آسٹریلیا اور دنیا کے دوسرے حصوں میں کمزور اقوام کے مادی وسائل پر قبضے سے متاثر تھے۔ یہ مذہب پر یقین نہیں رکھتے تھے لیکن یہودی نسلوں سے تعلق رکھنے اور یورپ میں نسلی تعصب کا نشانہ بننے کی وجہ سے قوم پرست بن چکے تھے۔ انہوں نے پہلے یوگنڈا کو اپنی سیٹلر کولونیل ریاست کیلئے موزوں جگہ قرار دیا۔ لیکن چونکہ یہودی عوام میں اس جگہ کی کوئی کشش نہیں تھی، لہٰذا انہوں نے فیصلہ کیا کہ انہیں فلسطین میں جا کر اس ریاست کی بنیاد رکھنی چاہیئے تاکہ شہریوں کی مطلوبہ تعداد پوری کرنے میں مذہبی وابستگی کو استعمال کیا جا سکے۔ شروع میں ان کے اس منصوبے کو یہودیوں کی اکثریت نے قبول نہیں کیا۔ البتہ

جرمنی میں نسل پرست نازی حکومت آنے کے بعد اس مذہب بیزار تنظیم کو بہت پذیرائی ملی۔ ہٹلر یہودیوں کو باقی غیر جرمن اقوام کی طرح پست سمجھتا تھا اور اس نے نسلی تعصب کی وجہ سے یورپ کے مفتوحہ علاقوں میں یہودی اور ہندوستانی نسل کے "جپسی" باشندوں کا قتل عام شروع کرر کھا تھا۔ اس قتل عام کے خوف سے یہودی یا تو امریکا بھاگ رہے تھے یا صیہونی تحریک کی پیروی کرتے ہوئے فلسطین جارہے تھے۔ اسی قتل عام کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر یہودی خدا پر یقین کھو بیٹھے۔ جنگ عظیم دوم کے بعد جب مردم شماری ہوئی تو معلوم ہوا کہ یورپی آبادی میں ساٹھ لاکھ یہودی کم ہو چکے تھے۔ ان ساٹھ لاکھ میں سے اکثر جنگ کے دوران مظلومی کی موت مارے گئے۔

صیہونی تحریک کیلئے سب سے بڑا مسئلہ دنیا بھر سے یہودیوں کو فلسطین کی طرف ہجرت کرنے پر مائل کرنا تھا۔ یہودی یورپ کے علاوہ مشرق وسطیٰ، برصغیر اور افریقہ میں بکھرے ہوئے تھے۔ یورپ کے یہودی اپنے اپنے ممالک اور ان کے موسم اور ثقافت سے محبت کرتے تھے، اور ان کے علمی اور مالی حالات بہتر تھے۔ اگرچہ انھیں نفرت پر مبنی کاروائیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا مگر پھر بھی کسی بھی انسان کیلئے اپنی جائیداد اور وطن چھوڑ کر کسی دوسرے انسان کی جائیداد اور وطن پر قبضہ کرنا آسان فیصلہ نہیں ہوتا۔ فلسطین کی آب و ہوا بھی ان کیلئے زیادہ پر کشش نہ تھی۔ مشرق وسطیٰ، افریقہ اور برصغیر میں بسنے والے یہودیوں کے حالات ان علاقوں کے باقی باشندوں جیسے تھے۔ انھیں کسی نسلی امتیاز کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ صیہونی تحریک کو ملک بنانے کیلئے لاکھوں کی تعداد میں یہودی چاہئیے تھے۔ یہ ضرورت اس وقت پوری ہوئی جب یورپ میں ہٹلر نے یہودیوں کا قتل عام شروع کیا اور اس کے نتیجے میں پانچ لاکھ یہودی فلسطین آ گئے۔ اگر ہولو کاسٹ نہ ہوتا تو اسرائیل کا قیام اور پھر اسکا دفاع افرادی قوت کی کمی کی وجہ سے ناممکن ہو جاتا۔ دوسری طرف اسرائیل کے قیام کا اعلان سن کر مشرق وسطیٰ اور افریقہ میں یہودیوں کے خلاف نفرت نے جنم لیا جس کی وجہ سے ان علاقوں سے بھی یہودی فلسطین کی طرف چلے گئے۔ آج بھی یہودیوں کو مسلمان علاقوں سے نکالنے کیلئے القاعدہ جیسی تنظیموں کی دہشتگردی ایک اہم اوزار ہے۔ پاکستان میں بسنے والے یہودیوں کو ڈرا کر فلسطین منتقل کرنے کا سہرا فروری 2002 میں ڈینیل پرل نامی یہودی صحافی کے قاتلوں کو جاتا ہے۔ دنیا کے کسی بھی علاقے سے یہودی آبادی کو نکالنے کا مطلب فلسطینیوں کی زمین پر قبضے میں حصہ ڈالنا ہے۔ یہ یہودی جب اسرائیل جائیں گے تو اسرائیلی حکومت انہیں کسی نہ کسی فلسطینی کی جائیداد پر ہی بسائے گی۔ یہ سادہ سی بات سمجھنے کیلئے جذبات کے بجائے عقل کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ یہ فلسطینیوں کے ساتھ دشمنی ہے بلکہ صیہونیوں کے جرائم کی سزا اپنے ہم وطن یہودیوں کو دینا اخلاقی اور اسلامی لحاظ سے بھی غلط ہے۔ اس حوالے سے اتاترک کے ترکی کا کردار کافی مثبت رہا، ترکی میں بسنے والے یہودیوں کو ملک چھوڑنے پر مجبور نہ کیا گیا۔ آج مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کے بعد یہودیوں کی سب سے بڑی تعداد ترکی میں بستی ہے۔ ایران نے بھی اپنے ملک میں یہودی اقلیت کے حقوق کو یقینی بنا کر انکی اسرائیل منتقلی کے عمل کو روکا ہے۔

جنگ عظیم دوم کے دوران یورپ سے فلسطین کی طرف یہودیوں کی ہجرت نے مغربی طاقتوں کو ایک بڑے مسئلے کا حل فراہم کر دیا تھا۔ جنگ عظیم دوم کے بعد مشرق وسطیٰ کو ترک کرتے ہوئے یورپ کی ایشیا اور افریقہ کے خام مال اور منڈیوں تک رسائی کی نگرانی ایک ایسی ریاست کے ذریعے کی جا سکتی تھی جو مقامی باشندوں سے ہمیشہ حالت جنگ میں رہے۔ ایسی صورت میں یہ ریاست ہر وقت مغربی طاقتوں کی محتاج رہے گی اور ان سے تعلقات اسکی مجبوری ہو گی۔ اس پس منظر میں اسرائیل کا قیام عمل میں لایا گیا۔ مقامی باشندوں کو بھی فلسطین کے آباد علاقوں میں ایک ریاست بنانے کا وعدہ کیا گیا۔ یہ علاقے آج کل بین الاقوامی قانون میں غزہ اور مغربی کنارے تک محدود ہیں لیکن یہاں کے باشندوں کو مکمل شہری حقوق ابھی تک حاصل نہیں ہو سکے ہیں۔

جنگ عظیم دوم میں جب ہٹلر یہودیوں کو مار رہا تھا تو باقی ممالک اور خود جرمن عوام نے اس ظلم پر کوئی توجہ نہ دی، یہ مغرب میں یہودیوں کو کمتر انسان سمجھے جانے کے ایک بہت گہرے رجحان کی عکاسی تھی۔ یورپ کی تاریخ اور ادب میں یہودیوں سے نفرت کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ یہاں تک کہ مغربی روشن خیالی کی تحریک کے بڑے بڑے علمبرداروں کی تحریروں میں جہاں بڑے جدید اور روشن تصورات پائے جاتے ہیں وہیں یہودیوں سے تعصب جیسا کھلا تضاد بھی دکھائی دیتا ہے۔ مشرق وسطیٰ کے باشندوں کے بارے میں بھی ان حضرات کے خیالات دوہرے معیار پر مبنی رہے ہیں، جن کا احاطہ ایڈورڈ سعید نے اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ امن، مساوات اور انسان دوستی کی باتوں میں انسان سے مراد یورپی نسل کا انسان لیا جاتا رہا ہے۔ اس وجہ سے جہاں صیہونی تحریک کے یہودی جمہوریہ کے تصور کو یہودی عوام میں پذیرائی ملی وہیں اسرائیل کے قیام کے بعد یورپی ممالک میں اسرائیل کے تحفظ کو یہودیوں کے واپس نہ آنے کی ضمانت سمجھا گیا۔

جنگ عظیم دوم کے بعد ہولوکاسٹ میں ساٹھ لاکھ انسانوں کے قتل عام پر بہنے والے اکثر آنسو مگرمچھ کے آنسو ہیں۔ جب یہ قتل عام ہو رہا تھا تو اس کو میڈیا میں اور جنگ کے فیصلوں میں کوئی اہمیت نہیں دی گئی تھی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا جنگ عظیم اول میں ترکی کی طرف سے پندرہ لاکھ آرمینی باشندوں کے قتل عام کے معاملے میں کیا گیا۔ البتہ جنگ عظیم دوم کے بعد عالمی طاقتوں نے فلسطین میں صیہونیوں کے جرائم سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں اور ان کی پشت پناہی کرتی رہی ہیں۔ اس سلوک کی وجوہات تہہ در تہہ ہیں۔ ایک تو اسرائیل یہودیوں کے یورپ سے نکلنے اور واپس نہ آنے کو یقینی بناتا ہے۔ دوسرے یہ مشرق اور مغرب کے سنگم پر موجود تجارتی راستوں کے تحفظ کو یقینی بناتا ہے جو یورپ کی کاروباری ضرورت ہے۔ اس کی تیسری اہم وجہ مسیحی صیہونیت ہے۔ بہت سے مذہبی مسیحی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ اس وقت تک دوبارہ ظہور نہیں کریں گے جب تک سب یہودی فلسطین میں اکٹھے نہیں ہو جاتے۔ انکے عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کے آنے پر ان یہودیوں کو عیسائیت اختیار کرنے اور موت میں سے ایک چیز کے انتخاب کا حق دیا جائے گا۔ اگرچہ یہ سوچ بھی بنیادی طور پر یہودیوں کے بارے میں نفرت پر مبنی ہے لیکن نسل پرستی والے عنصر کی طرح اس عنصر

نے بھی اسرائیل کے لئے مغربی معاشروں میں بہت حمایت پیدا کی ہے۔اسرائیل کو حاصل تحفظ کی چوتھی بڑی وجہ اسلام دشمنی ہے۔یورپ کا اسلام سے واسطہ بہت پرانا ہے اور ہر مذہبی اختلاف کی طرح مسلم مسیحی اختلاف نے بھی نفرت کو جنم دے رکھا ہے۔نہ صرف یہ بلکہ ترکی، شامات اور شمالی افریقہ کو رومی سلطنت کے قبضے سے مسلمانوں نے آزاد کرایا تھا۔ مسیحی مبلغین کی اسلامی مخالف تبلیغ اور صلیبی جنگوں نے بھی مغربی ذہن پر گہرے اثرات چھوڑے۔ان سب عوامل کو ذہن میں رکھے بغیر یا ان میں سے کسی ایک کا سادہ دلی یا جلد بازی کی وجہ سے انکار کر کے مشرق وسطیٰ کے حالات کو نہیں سمجھا جا سکتا۔

باب دوم: عرب دنیا میں حافظ الاسد کا کردار

اقوام متحدہ میں مغربی طاقتوں نے جو اسرائیل بنایا تھا وہ نہایت کمزور ملک تھا۔ اس کو دو مسائل درپیش تھے۔ پہلا مسئلہ یہ کہ جس علاقے پر یہ ریاست قائم ہوئی تھی، وہاں اکثریت فلسطینی مسلمانوں کی تھی۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ اس ریاست کے شمالی اور جنوبی حصے کا رابطہ دس کلومیٹر چوڑی پٹی پر مشتمل تھا۔ اس ریاست کے تل ابیب جیسے اہم رہائشی اور معاشی علاقے بھی اسی تنگ پٹی میں موجود تھے۔ کسی بھی جنگ کی صورت میں اس ریاست کو مغربی امداد پہنچنے سے پہلے نابود کیا جاسکتا تھا۔ صیہونی قیادت نے پہلے مسئلے کا حل یہ نکالا کہ 1948 میں نکبہ کے نام سے جانا جانے والا قتل عام کیا جس کے نتیجے میں اس علاقے کے اکثر فلسطینی اپنے گھر بار کو چھوڑ کر پڑوسی عرب ممالک میں مہاجر بن گئے۔ اقوام متحدہ نے ایک قرارداد میں اس بے دخلی کی مذمت کی اور فلسطینی مہاجرین کی اسرائیل کے زیر انتظام علاقوں میں واپسی کی سفارش کی، اور یہ بھی کہا کہ اگر یہ لوگ واپس نہ آسکے تو ان کی اولادیں واپسی کا حق رکھتی ہیں۔ حال ہی میں سامنے آنے والی تاریخی دستاویزات سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اس قتل عام سے پہلے صیہونی قیادت نے اردن کے بادشاہ سے معاہدہ کیا تھا کہ وہ ان فلسطینیوں کے انخلا کو پناہ دینے کے نام پر یقینی بنائے گا۔ یہاں سے اردن کے شاہی خاندان کے صیہونی ریاست سے پرانے تعلقات کا پتا چلتا ہے نیز یہ بات سمجھنے میں کوئی ابہام نہیں رہتا کہ کیوں اردن نے اسرائیل کو تسلیم کر رکھا ہے اور کیوں اردن میں کسی عرب بہار یا انقلاب کا نام ونشان نہیں ملتا؟ اس قتل عام کے رد عمل میں عرب عوام میں بڑھتی ہوئی بے چینی کے سد باب کیلئے 1948 میں مصر، اردن اور شام کی حکومتوں نے اسرائیل پر حملہ کیا، جو اسرائیل کی بھرپور تیاری اور جدید ہتھیاروں کے سامنے پسپا ہو گیا۔ تلواریں، بندوقیں اور گھوڑے، جدید مشین گنوں، توپوں اور فضائیہ سے ہار گئے۔ اسرائیل نے فلسطینی اکثریت کے بعض دیگر علاقوں (جیسے الجلیل) پر بھی قبضہ کر لیا جن کے باسی آج اسرائیل کے عرب شہری کہلاتے ہیں اور نسلی امتیاز کا نشانہ بنتے رہتے ہیں۔ اب اسرائیل شام اور لبنان کا پڑوسی بھی بن گیا تھا۔

اسرائیل کو اپنا دفاع مضبوط بنانے کا دوسرا موقع اس وقت ملا جب مصر میں جمال عبدالناصر نے فرانس اور برطانیہ کے نہر سویز پر قبضے کے خلاف حکم جاری کرتے ہوئے نہر سویز کو قومی تحویل میں لے لیا۔ نہر سویز کو 1869 میں فرانس کی ایک کمپنی نے تعمیر کیا تھا اور اس وقت کے مصری بادشاہ سے معاہدہ کیا تھا کہ یہ نہر اگلے سو سال تک اس کمپنی کی ملکیت رہے گی۔ معاہدے کے مطابق مصر کو 1969 میں اس نہر کا قبضہ ملنا تھا مگر جمال عبدالناصر نے 1956 میں اس کو قومی تحویل میں لینے کا اعلان کر دیا۔ اسرائیل نے اس موقعے کو غنیمت جانا اور فرانس اور برطانیہ کے ساتھ مل کر مصر پر حملہ کر دیا اور اسی دوران فرانس سے ایٹم بم بنانے کیلئے نیوکلیئر لیبارٹری بھی خرید لی۔ امریکا نے اس جنگ سے پہلے اجازت طلب

نہ کئے جانے کی مذمت کی اور جنگ بندی کرادی۔ اس جنگ میں جارح اسرائیل، برطانیہ اور فرانس تھے اور اسرائیل کے سوا کسی فریق کو کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا۔ مصر اور شام نے اسرائیل کے بڑھتے ہوئے عزائم کو دیکھ کر اپنی فوجی طاقت میں اضافہ شروع کر دیا۔

اب اسرائیل کیلئے اگلا ہدف شام کی سرحد کے ساتھ موجود پہاڑیاں تھیں۔ یہ پہاڑی سلسلہ جولان کہلاتا ہے۔ یہ جنگی اعتبار سے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس سلسلے کی اہم بات شام کی طرف موجود قدرتی خندق ہے جو شامی فوج کی شام سے اسرائیل کی جانب نقل و حرکت کے لیے بہت بڑی رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ یہاں پانی کے ذخائر موجود ہیں جن پر قبضے کے بعد "مشرق وسطیٰ کے صحرا میں ہرے بھرے اسرائیل" کا خواب پورا ہو سکتا تھا۔ عربوں کے پانی کو اسرائیلی صحراؤں میں بہا کر صحرا کو قابل کاشت بنایا جا سکتا تھا۔ 1967 میں جمال عبدالناصر نے حسب معمول ڈینگیں مارتے ہوئے صحرائے سینا میں موجود اقوام متحدہ کے امن لشکر کو مصر سے نکال دیا۔ اس فضا نے اسرائیل کو ایک اور موقع فراہم کیا۔ مصر جنگ کے آغاز کیلئے تیار نہیں تھا۔ اسرائیل نے اچانک مصر اور شام کے ہوائی اڈوں پر حملہ کر کے دونوں ممالک کی فضائیہ کو بھاری نقصان پہنچایا۔ یہ جنگ چند روز جاری رہی اور اسرائیل نے جولان کی پہاڑیوں اور مصر کے صحرائے سینا پر قبضہ کر لیا۔ شام کی حکمران بعث پارٹی کے مرکزی قائدین میں حافظ الاسد نے ان تمام واقعات اور عرب قیادت کی حماقت کو قریب سے دیکھا تھا۔ عرب نہ صرف اسلحے کے اعتبار سے پسماندہ تھے بلکہ ان کی انٹیلی جنس ایجنسیاں اسرائیل کے منصوبوں کے بارے میں درست اطلاعات حاصل کرنے میں ناکام رہی تھیں۔ شام کی کمیونسٹ بعث پارٹی کی حکومت کی طرف سے ''عوامی فوج'' جیسے غیر پیشہ وارانہ منصوبے ناکام رہے تھے۔ اسی طرح ملک میں آمرانہ معاشی قوانین کی وجہ سے گھٹن میں اضافہ ہوا تھا۔ حکومت اور عوام میں دوریاں تھیں۔ شام کی حکومت خارجی تعلقات میں بھی تنہائی کا شکار ہو گئی تھی۔ 1970 میں اردن کے شاہ نے پاکستانی بریگیڈیئر ضیاء الحق کی قیادت میں فلسطینی مہاجرین کا قتل عام کرایا۔ (ضیاء الحق اس وقت ایک تربیتی مشن پر اردن میں تعینات تھا۔ واپسی پر اسکو ترقی دے کر پہلے کور کمانڈر اور بعد میں چیف آف آرمی سٹاف بنایا گیا)۔ شام کی حکومت نے اس وقت اردن پر حملے کے سوال پر غور و فکر کیا۔ اس وقت وزیر دفاع حافظ الاسد نے فلسطینیوں کے جانی نقصان کو کم سے کم رکھنے کیلئے زمینی فوج کا ایک بریگیڈ فلسطینی قیادت کے زیر اثر قرار دیا۔ شام اردن سے مکمل جنگ کا اعلان نہیں کر سکتا تھا کیونکہ مکمل جنگ کی صورت میں اسرائیل اور امریکا کی طرف سے اردن کی حمایت کے نام پر شام پر ایسا حملہ متوقع تھا جس کیلئے شامی فوج تیار نہیں تھی۔ حافظ الاسد اور اس کے دوست کئی سالوں سے داخلی انتشار اور کمزوریوں کی اصلاح کی کوشش کر رہے تھے۔ اردن میں ہونے والے سانحے کے بعد حافظ الاسد نے حکمران جماعت اور حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی۔ شام اسرائیل کے ساتھ مسلسل حالت جنگ میں چلا آ رہا ہے۔ ایسے حالات میں حافظ الاسد نے جہاں شام اور اس سے باہر انٹیلی جنس

ایجنسیوں کا جال بچھایا اور شام میں جدید علوم اور صنعت کو فروغ دیا، وہاں داخلی اعتبار سے کچھ سخت اقدامات بھی اٹھائے تاکہ اس جنگ کے دوران اندرونی دشمنوں کے وار سے محفوظ رہا جاسکے۔

چھ اکتوبر 1973 میں، جب اسرائیل میں چھٹی کا دن تھا، حافظ الاسد اور مصر کے انور سادات نے اسرائیل پر حملہ کر دیا۔ یہ پہلی عرب اسرائیل جنگ تھی جو عرب قیادت نے شروع کی تھی۔ اس کیلئے بھرپور تیاری کی گئی تھی اور اسرائیلی جاسوسی اداروں کو اس حملے کی بھنک نہیں پڑی تھی۔ اسرائیل کے ایٹمی حملے کے جواب کیلئے حافظ الاسد نے کیمیائی ہتھیار جمع کر لیے تھے۔ یہ حملہ نہایت کامیاب رہا اور شام نے جولان کی پہاڑیوں میں پیش قدمی شروع کر دی۔ لیکن اسی وقت انور سادات نے صحرائے سینا میں اپنی فوج کی پیش قدمی روک لی۔ انور سادات یہ سمجھتا تھا کہ اسکی وقتی پیش قدمی اسرائیل کو مذاکرات کی میز پر لے آئے گی۔ وہ امریکا سے اچھے تعلقات کا خواہاں ہونے کی وجہ سے اسرائیل پر کوئی کاری وار لگانے کا قائل نہیں تھا۔ دوسری طرف اسلحے سے بھرے امریکی جہاز اسرائیل کی بندرگاہوں پر آنے لگے۔ شام کی فوج چونکہ اسرائیل کیلئے سب سے قریبی خطرہ تھی، اسرائیل اور امریکا نے اپنا تمام زور شام پر حملے میں صرف کر دیا۔ شام کے کچھ قصبوں کو آزاد کرانے کے بعد جولان کی پہاڑیوں میں شامی فوج کو سخت مشکلات کا سامنا ہوا اور وہ پہاڑیاں آزاد نہ کرائی جاسکیں۔ البتہ اس جنگ کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ شام نے قنیطرہ کا علاقہ واپس لے لیا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب پاکستان کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے شامی فضائیہ کی مدد کیلئے پاکستانی پائلٹوں کا دستہ بھیجا۔

اسرائیل نے شام کا حملہ پسپا کرنے کے بعد انور سادات کو بھی اسکی حماقت کا سبق سکھایا اور مصر پر حملہ کر کے اسکی فوج کو دارالحکومت قاہرہ سے صرف اسی کلومیٹر کے فاصلے تک دھکیل دیا۔ اب مذاکرات میں اسرائیل کا پلڑا بھاری ہو گیا تھا۔ چھ سال تک چلنے والے مذاکرات کے سلسلے میں حافظ الاسد نے یہ موقف اپنایا کہ اسرائیل کے ساتھ عربوں کے تمام مسائل کو ایک ساتھ حل کرنا چاہیئے۔ وہ اس بات کا قائل تھا کہ بین الاقوامی قانون کے تحت اسرائیل کو قبضے میں لیے گئے علاقے ترک کرنے اور گھروں سے نکالے گئے فلسطینی واپس اپنے علاقوں میں پہنچائے جانے چاہیئیں۔ البتہ امریکا اور اسرائیل، مصر اور شام کو عرب اسرائیلی تنازعے کی مساوات سے خارج کرنا چاہتے تھے۔ امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر نے تعریفیں کر کے انور سادات کو شیشے میں اتار لیا تھا۔ انور سادات نے آہستہ آہستہ سب اصولی باتوں سے منہ پھیر لیا۔ مصر نے صحرائے سینا کا علاقہ واپس ملنے کی شرط پر اسرائیل کو تسلیم کر لیا مگر شام نے فلسطین کا مسئلہ حل کئے بغیر اسرائیل کو بطور ریاست تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ البتہ اسرائیل نے مصر کے مزاحمت سے نکل جانے اور اسرائیل کو تسلیم کرنے جیسے اقدامات پر اکتفا نہ کیا۔ انہوں نے انور سادات سے یہ بھی منوایا کہ صحرائے سینا میں کم فوج رکھو گے، ہماری کشتیوں کو نہر سویز سے مفت گزرگاہ فراہم کرو گے۔ حافظ الاسد نے اس خیانت کے بعد مصر سے تعلقات ختم کر دیئے۔ حافظ الاسد کی ایک خوبی عالمی طاقتوں کے اعلیٰ تربیت یافتہ مذاکرات کاروں کے ساتھ کسی معاملے کی جزئیات اور

تفصیلات پر گھنٹوں مذاکرات کرنے کی صلاحیت تھی۔ یہ ان معاملات کے بارے میں اس کے گہرے مطالعے کے ساتھ ساتھ اسکی ذہانت اور اس کی حاضر دماغی کی دلیل تھی۔ یہ مذاکرات بعض اوقات دس دس گھنٹوں تک چلتے رہتے تھے۔ اسی صلاحیت کی وجہ سے اس نے کبھی کوئی کمزور معاہدہ یا اعلامیہ جاری نہیں کیا۔ ہنری کسنجر کو اس چیز کا احساس ہو گیا کہ اسرائیل کیلئے اصلی رکاوٹ اسد ہے اور اسد کو ہٹانے کے سوا امریکا کے پاس کوئی راستہ نہیں ہے۔

امریکا ویتنام کی جنگ میں براہ راست مداخلت سے سبق سیکھ چکا تھا۔ اب اس نے اپنی جنگ فرقہ پرست تنظیموں کے کندھوں پر رکھنے کا گر سیکھ لیا تھا۔ اس فارمولے کا کامیاب تجربہ افغانستان میں جاری تھا جہاں فرقہ پرست تنظیموں کے ہزاروں مسلح افراد پرائی جنگ لڑ رہے تھے۔ شام کی سنی فرقہ پرست تنظیم ''اخوان المسلمون'' میں شروع سے ہی فرقہ وارانہ رنگ غالب رہا ہے۔ حافظ الاسد کا تعلق علوی فرقے سے تھا اور اس بات نے اخوان المسلمون کے تنگ نظر کارکنان کو غیض و غضب سے بھر رکھا تھا۔ جس وقت مذاکرات کی میز پر حافظ الاسد عربوں کے مفادات کی جنگ لڑ رہا تھا، شامی اخوان المسلمون نے شام میں علویوں کی ٹارگٹ کلنگ اور بم دھماکوں کا سلسلہ شروع کیا جس میں سینکڑوں بے گناہ افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ حافظ الاسد کی طرف دو گرنیڈ پھینکے گئے جن میں سے ایک کو اس نے اپنے پاؤں کی ٹھوکر سے دور کیا اور دوسرے پر ایک شامی فوجی نے لیٹ کر امت کے اس عظیم سیاسی سرمائے کو بچا لیا۔ یہ سلسلہ یہاں تک پہنچا کہ 1982 میں حماہ شہر پر سوات کے طالبان کی طرح قبضہ کر کے طالبانی قانون نافذ کر دیا گیا۔ سرکاری اداروں کے بے گناہ اہلکاروں کو ذبح کر دیا گیا۔ یہ عالم اسلام کی جدید تاریخ میں دہشتگردوں کی پہلی بڑی فتح تھی۔ حافظ الاسد نے اس شہر کو فوج کے حوالے کر دیا۔ ایک مہینے کی لڑائی کے بعد اخوان المسلمون کو شکست ہو گئی۔

شام ایک ایسا ملک ہے جہاں متعدد اقوام اور مذاہب کے لوگ بستے ہیں، ایسے میں ایک فرقہ پرست جماعت کا اسلحہ اٹھا کر کسی شہر پر قبضہ کرنا بیوقوفی ہے۔ لیکن ان فرقہ پرست تنظیموں کا مسئلہ یہ ہے کہ مسلمان عوام اپنی سیاسی قیادت ان کے ہاتھوں میں دینے کو آمادہ نہیں ہوتے۔ وہ ان کے زیر اثر رہنے کو پسند نہیں کرتے۔ اگر عوام کسی حکومت کو بدلنا چاہیں تو اس کا آسان راستہ سول نافرمانی اور لاکھوں کی تعداد میں اہم شہروں کی سڑکوں پر نکل کر حکومت کو مفلوج کرنا ہوتا ہے۔ کوئی حکومت شہریوں کی شمولیت کے بغیر نہ ٹیکس اکٹھا کر سکتی ہے، نہ فوج، پولیس، انتظامیہ، مواصلات، صحت اور تعلیم جیسے اہم محکمے چلا سکتی ہے۔ اگر اخوان المسلمون کو سیاسی تحریک کی کامیابی کی ذرا سی بھی امید ہوتی تو وہ کبھی اسلحہ نہ اٹھاتی۔ اکثر مذہبی تنظیمیں بہت زیادہ تنگ نظر ثابت ہوتی ہیں اور یہی صورت حال اخوان المسلمون کو درپیش رہی ہے جو اپنی تنظیم کے کارکنان کو بڑی بڑی شخصیات پر ترجیح دیتی ہے۔ حال ہی میں خفیہ دستاویزات کے سامنے آنے پر معلوم ہوا ہے کہ امریکا نے 1983 میں صدام حسین کو شام پر حملے کا مشورہ دیا تھا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب شام میں اخوان المسلمون کی

شورش بڑھ چکی تھی۔ لیکن صدام اس وقت ایران عراق جنگ میں پھنسا ہوا تھا اور شام کی فوج عراق کی فوج سے کہیں زیادہ تربیت یافتہ اور مضبوط تھی۔

اس دوران لبنان میں اسرائیلی دخل اندازیاں بہت بڑھ چکی تھیں اور وہاں مسلم مسیحی فسادات عروج پر پہنچا دیئے گئے تھے۔ عرب لیگ نے شام سے لبنان کی خانہ جنگی کو ختم کرنے کیلئے فوج بھیجنے کی اپیل کی جس کا حافظ الاسد نے مثبت جواب دیا اور کافی حد تک فسادات کو کنٹرول کیا۔ مصر سے جان چھڑا لینے اور شام میں اخوان المسلمون کی مدد سے شورش برپا کرنے کے بعد اسرائیل نے لبنان کی سرسبز زمین کو اپنے زیر تصرف لانے کیلئے حملہ کر دیا۔ یہ 1982 کا سال تھا۔ لبنان میں اسرائیل نے مسیحی تنظیموں کو استعمال کرتے ہوئے صابرہ اور شتیلا کے علاقوں میں فلسطینیوں کا قتل عام کرایا۔ اسرائیل نے لبنان کے جس جنوبی علاقے پر قبضہ کیا تھا وہ شیعہ اکثریت کا علاقہ تھا۔ اسرائیل کے شمال میں واقع یہ چھوٹا مگر سرسبز علاقہ اپنے دریاؤں اور زراعت کی وجہ سے اسرائیل کی غذائی ضروریات اور زرعی صنعت کیلئے موزوں تھا۔ شامی فوج نے آگے بڑھ کر اسرائیل کو مزید پیش قدمی سے روک لیا۔ دوسری طرف حافظ الاسد نے شیعہ رہنماؤں کو پیغام بھیجا کہ وہ اپنے عوام کو ہجرت سے روکیں کیونکہ اگر انہوں نے فلسطینیوں کی طرح ایک مرتبہ ہجرت کر لی تو اسرائیل اس علاقے میں ان کو واپس نہیں آنے دے گا۔ حافظ الاسد نے ایران سے رابطہ کر کے حزب اللہ کی بنیاد رکھی اور اس کو تمام تربیت اور انٹیلی جنس سپورٹ فراہم کی۔ اس تنظیم نے اٹھارہ سال آزادی کی جنگ لڑ کر سن 2000 میں اسرائیل کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ ایران میں انقلاب کے بعد شام تنہا نہیں رہا تھا بلکہ اسے ایران کی شکل میں ایک مضبوط اتحادی میسر آ گیا تھا۔ نوے کی دہائی میں یاسر عرفات کی طرف سے اسرائیل کو تسلیم کرنے اور اوسلو معاہدے پر دستخط کے بعد حافظ الاسد نے فلسطینی مزاحمت کی تنظیم حماس کی بھی بنیاد رکھی۔ حزب اللہ اور حماس کی قیادت نے ہمیشہ اس سلسلے میں شام کی امداد کا شکریہ ادا کیا ہے۔ اسرائیلی قبضے سے جنوبی لبنان کی آزادی اور غزہ سے اسرائیلی بستیوں کا ختم ہونا صرف شام کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔ اب بھی اگر اسرائیلی حملوں کے سامنے حماس مزاحمت کرتی ہے تو اس کا سبب شام کی بے دریغ مدد ہے۔ کوئی بھی مزاحمتی گروہ کسی ملک کی پشت پناہی کے بغیر اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتا۔

حافظ الاسد کا عربوں پر یہ احسان ہے کہ اس نے تیس سال تک اسرائیل کے سامنے صبر اور بصیرت کے ساتھ دفاع کیا ہے۔ وہ عرب جو آج شیعہ سنی کی بنیاد پر اسد خاندان سے چالیس سالہ مزاحمت کا انتقام لے رہے ہیں، غیرت سے عاری ہیں۔ انکی اپنی حالت یہ ہے کہ مصر میں اخوان المسلمون کے مرسی صاحب اقتدار سنبھالنے کے بعد چالیس گھنٹے بھی اسرائیل کے سامنے مزاحمت نہ کر سکے تھے اور عوام کی طرف سے بند کیا جانے والا قاہرہ کا اسرائیلی سفارت خانہ بحال کر دیا تھا۔ ترکی میں پندرہ سال سے جماعت اسلامی کے ممدوح طیب اردگان کی حکومت ہے۔ یہ خود ساختہ عثمانی خلیفہ اسرائیل سے سفارتی اور تجارتی تعلقات برقرار رکھے ہوئے ہے۔ دوسری طرف جب فلسطینی اور لبنانی عوام کو ترکی،

مصر، سعودی عرب اور اردن نے اسرائیل کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تو حافظ الاسد نے حزب اللہ اور حماس بنا کر پہلی صف میں مزاحمت کا چراغ روشن رکھا۔

حافظ الاسد علوی تھا لیکن اس نے سنی فلسطینیوں کیلیئے بڑی طاقتوں کو اپنا دشمن بنا لیا، جبکہ فلسطینی سب کے سب سنی ہیں۔ حافظ الاسد نے شام میں اکثریتی مسلک اہلسنت کو ہی سرکاری مسلک قرار دیا۔ جس دن اخوان المسلمون میں اتنی وسعت قلبی آگئی اس دن وہ اسد پر تنقید کرتے اچھے بھی لگیں گے، ابھی تو انکی تنقید صرف کسی بزدل کی طرف سے اپنے محافظ کی کمر میں چاقو گھونپنے سے زیادہ کچھ نہیں۔ اسد نے لبنان اور غزہ آزاد کرا لیے، فلسطین کا مسئلہ زندہ رکھا۔ اگر اسد نہ ہوتا تو امریکہ، کینیڈا اور آسٹریلیا کے مقامی باشندوں کی طرح فلسطینی بھی بھلا دیئے جاتے۔

باب سوم: بشار الاسد اور مشرق وسطیٰ

مشرق وسطیٰ میں شام کی حکومت سوشلسٹ بعث پارٹی کی حکومت ہے۔ایسی حکومتوں میں فرد واحد کی بجائے ماہرین کی جماعت اہم فیصلے کرتی ہے۔شام میں ہر سات سال بعد انتخابات ہوتے ہیں۔ اس کی مثال کیوبا، وینزویلا، ویتنام وغیرہ جیسے ممالک کی حکومتیں ہیں۔ یہ حکومتیں اپنے علاقوں میں بڑی طاقتوں کی من مانی کے خلاف مزاحمت کرتی رہی ہیں۔اس سلسلے میں یہ حکومتیں اپنی سرحدوں تک محدود نہیں رہیں۔ نیز ان حکومتوں نے اپنے ممالک میں سائنس اور ٹیکنالوجی کو بھی فروغ دیا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں شام ایک ایسا ملک ہے جو اپنی ضرورت کے ڈاکٹر، انجنیئرز اور سائنس دان خود پیدا کرتا رہا ہے۔ اگرچہ شام میں سوشلسٹ پارٹی کے علاوہ سات دیگر جماعتیں بھی موجود ہیں لیکن ان کو عوام میں زیادہ پذیرائی نہیں مل سکی۔

حافظ الاسد کے زمانے میں ملٹی نیشنل کمپنیوں کو شام میں کاروبار کی اجازت نہیں تھی اور شام اپنی ضروریات مقامی صنعت سے پوری کرتا تھا۔ اگرچہ شام میں امیر اور غریب میں زیادہ فرق نہیں تھا لیکن حکمران جماعت سے تعلق رکھنے والے زیادہ تر افراد امیر یا متوسط ہیں۔ شام میں اہل سنت مسلک کو سرکاری مسلک کی حیثیت حاصل ہے لیکن کسی پر مذہب مسلط نہیں کیا جاتا۔ شام میں اہلسنت کی آبادی 75% ہے جن میں اکثر عرب اور باقی کرد یا ترکمانی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ شام کے اکثر اہل سنت شافعی مسلک کے پیرو ہیں جبکہ حنفی، سلفی اور اخوان المسلمون بہت کم تعداد میں ہیں۔ شام میں 10 فیصد مسلمان علوی ہیں اور صرف دو فیصد شیعہ ہیں۔ شام میں دروز کے نام سے جانے جانیوالے اسماعیلی کل آبادی کا تین فیصد ہیں۔ یہ ایک ہزار سال پہلے کے مصر کی فاطمی خلافت کی باقیات میں سے ہیں۔ بقیہ آبادی آرمینائی اور آشوری مسیحیوں کی ہے جو دنیا کے قدیم ترین مسیحی ہیں۔ شام کے عوام صدیوں سے ساتھ ساتھ رہ رہے ہیں اور اکثر معتدل مزاج رکھتے ہیں۔ شام میں حجاب کرنے اور نہ کرنے اور داڑھی رکھنے اور نہ رکھنے کو ذاتی فیصلہ سمجھا جاتا ہے۔ شامی سوشلسٹ حکومت کی خارجہ اور داخلہ پالیسی شامی عوام کے مزاج سے ہم آہنگ رہی ہے۔

سن 2000 میں دس جون کو اسد العرب حافظ الاسد کی وفات کے بعد شامی حکمران جماعت نے اس کے بیٹے بشار الاسد کو اپنا سربراہ چن لیا۔ اگرچہ حکمران جماعت میں کئی لوگ صدارت کے منصب کے اہل تھے لیکن بشار کا انتخاب اس لیے کیا گیا کہ اس کا حافظ الاسد کا بیٹا اور وارث ہونا عوام میں قبولیت کیلئے اچھی بنیاد بن سکتا تھا۔ البتہ حکمران جماعت میں اہم فیصلے تجربہ کار لوگوں کی رائے کے مطابق ہی لیے جاتے رہے ہیں۔ بشار الاسد اپنے ایام طالب علمی میں سیاست کی بجائے میڈیکل سائنس سے دلچسپی رکھتا تھا اور اس دلچسپی کی وجہ سے اس نے ڈاکٹر بننے کا فیصلہ کیا۔ انگلینڈ میں میڈیکل کی تعلیم

کے دوران اسکی ملاقات معاشیات کی طالبہ اسماسے ہوئی جس کا تعلق شام کے ایک شافعی سنی خاندان سے تھا،انہوں نے بعد میں شادی کرلی۔اسماء سے شادی کے بعد بشار نے سنی شافعی مسلک اختیار کرلیا۔وہ ہاتھ باندھ کر نماز پڑھتاہے۔حافظ الاسد اپنے بڑے بیٹے باسل الاسد کو سیاسی اور عسکری تربیت دے رہا تھالیکن جنوری 1994 میں ایک ٹریفک حادثے میں اس کا انتقال ہو گیا۔حافظ الاسد نے اس کے بعد بشار الاسد کو سیاسی اور عسکری قیادت کیلئے تیار کرنا شروع کیا۔یہ نوے کی دہائی تھی اور شام کا مضبوط ترین اتحادی روس داخلی بحرانوں سے گزر رہا تھا۔لبنان کے جنوبی حصے میں اسرائیلی اور شمالی حصے میں شامی فوج موجود تھی۔حافظ الاسد نے بشار کو لبنانی اور فلسطینی محاذ پر تعینات کیا۔یہ تعیناتی بشار الاسد کی شخصیت سازی کا اہم عنصر ہے کیوں کہ اس عرصے میں اس خطے میں نہایت اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔لبنان میں حزب اللہ اور غزہ میں حماس اسرائیل کے ساتھ گوریلا جنگ لڑ رہے تھے اور ان کی پشت پناہی شامی انٹیلی جنس ایجنسیاں کر رہی تھی۔ان تنظیموں کو ویتنام میں ہوچی منہ کی فوج کی طرز پر تربیت دی گئی تھی اور انہوں نے زیر زمین سرنگیں بنا کر اسرائیل کی ناک میں دم کرر کھا تھا۔اس جنگ کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسرائیل سن 2000 میں لبنان اور سن 2005 میں غزہ سے نکل گیا۔یہ اسرائیل کے خلاف مسلمانوں کی پہلی کامیابی تھی۔

بشار الاسد اپنے باپ کی طرح ٹھنڈے دماغ سے تفصیلات میں جا کر سوچنے اور منصوبہ بندی سے آگے بڑھنے والا شخص تھا مگر اپنے باپ کے برعکس تجارت کو زیادہ آزاد کرنے کو بہتر سمجھتا تھا۔حافظ الاسد کے برعکس انٹیلی جنس ایجنسیوں کے اثرورسوخ کو بھی کم کرنا چاہتا تھا۔اس نے سن 2000 میں اقتدار میں آنے کے بعد کوکا کولا جیسی ملٹی نیشنل کمپنیوں کو ملک میں تجارت کی اجازت دی۔ملک کے کونے کونے میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ پہنچایا،غیر ملکی خبر رساں اداروں کے صحافیوں کو کھلے عام گھومنے کی اجازت دی۔بی بی سی نے اسی آزادی کا فائدہ اٹھا کر بہت سے شامیوں کو صحافتی تربیت کے پروگرام میں بھرتی کرکے جعلی ویڈیو بنانے اور پروپیگنڈا کرنے کی تربیت بھی دی۔

ادھر اسرائیل کیلئے لبنان اور غزہ سے نکلنا اچھا تجربہ نہیں تھا۔اسرائیل کی دفاعی حکمت عملی کا اہم ستون پڑوسی عرب عوام کو خوف میں رکھنا ہے۔اس انخلاء سے یہ پیغام گیا تھا کہ اسرائیل کو بھی علاقے چھوڑنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ لبنان کے بہت سے سنی، شیعہ اور مسیحی اسرائیلی جیلوں میں قید تھے۔حزب اللہ، لبنان اور شام کی طرف سے کئی کوششوں کے باوجود وہ قیدی رہا نہیں کئے جارہے تھے۔اسرائیل ایک اور جنگ کی تیاری کر رہا تھا اور اس کا اشارہ کونڈو لیزا رائس کی جانب سے جون 2006 میں تل ابیب میں پیش کئے گئے جدید مشرق وسطیٰ کے تصور سے بھی ملتا ہے۔ شام نے اس جنگ کیلئے حزب اللہ کو تیار کیا اور مناسب وقت دیکھ کر حزب اللہ نے جولائی 2006 میں اسرائیلی چوکی پر حملہ کرکے دو فوجی قیدی بنالیے۔جنگ اسرائیل کی مکمل تیاری سے پہلے شروع ہو گئی تھی۔اسرائیل نے لبنان پر حملہ کر دیا اور 33 دن تک جنگ جاری رہی۔اس دوران بہت سی شہری آبادیوں پر بھی حملے ہوئے،اس تباہی کی تصویریں آج

بھی شام کے عنوان سے سوشل میڈیا پر بھٹکتی نظر آجاتی ہیں۔اس جنگ میں ہونے والی تباہی کو کونڈالیزا رائس نے زچگی کے درد سے تشبیہ دی جو نئے مشرق وسطیٰ کو جنم دینے کیلئے ضروری تھا۔البتہ اس جنگ میں لبنان کے سرحدی علاقوں میں بچھے زیر زمین سرنگوں کے جال کی وجہ سے اسرائیل کو بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑ رہا تھا اور اسکی فوج پیش قدمی سے قاصر رہی تھی۔ نیز شام کے ذریعے ملنے والے ایرانی اور روسی اسلحے کی بدولت حزب اللہ اسرائیل کے اندر دور تک میزائل پھینک رہی تھی۔آخر کار اسرائیل نے جنگ بندی کر کے لبنانی قیدیوں کی رہائی کے بدلے اپنے دو فوجیوں کی لاشیں واپس لیں۔اس سے اگلے سال فلسطین میں شہری انتظام کیلئے انتخابات ہوئے اور غزہ میں حماس نے وہ انتخابات جیت لیے۔

دسمبر 2008 میں اسرائیل نے غزہ سے حماس کو ختم کرنے کیلئے فوجی آپشن کا استعمال کیا مگر شام نے صحرائے سینا میں پھیلے نیٹ ورک کے ذریعے غزہ میں زیر زمین سرنگوں کو مزید بہتر بنا دیا تھا۔ حماس کے کارکنان گوریلا جنگ اور جدید ہتھیاروں کے استعمال کی تربیت حاصل کئے ہوئے تھے اور غزہ میں دفاعی و غذائی ساز و سامان بھی کافی مقدار میں موجود تھا۔جدید مشرق وسطیٰ کا منصوبہ کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔اس دوران شام پر مختلف طریقوں سے دباؤ ڈالا جاتا رہا مگر بشار الاسد اس اصولی پالیسی سے انحراف کرنے سے انکاری رہا جو اس کے باپ نے بنائی تھی،اسکی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ عوام بشار سے حافظ الاسد کے سی بصیرت کی توقع رکھتے تھے اور وہ عوام کی اس امید پر پورا اترا۔اسی دوران شام نے ایران اور روس سے دفاعی معاہدے کئے،ایران اور شام نے اعلان کیا کہ کسی ایک پر حملہ دونوں پر حملہ تصور کیا جائے گا۔بشار الاسد ایک دوسرا حافظ الاسد بن کر سامنے آیا تھا۔ان ناکامیوں کے بعد اسرائیل نے حکمت عملی بدل کر دوسرے طریقے اختیار کرنے شروع کر دیئے۔

اسرائیل کیلئے قدرتی وسائل میں اہم ترین چیز زمینی علاقہ ہے۔اسے فلسطینیوں سے پاک فلسطین چاہیئے۔اگر شام حزب اللہ اور حماس کی مدد سے باز آ کر بین الاقوامی قانون میں موجود حقوق سے دست بردار ہو جائے تو باقی عرب قیادت سے مل کر اسرائیل کیلئے فلسطینیوں کے قدرتی وسائل پر قابو رکھنا آئینی حیثیت حاصل کر سکتا ہے۔اسرائیل چونکہ ایک یہودی جمہوریہ رہنا چاہتا ہے لہٰذا وہ لاکھوں فلسطینی مہاجرین کی اپنے علاقوں میں واپسی بھی قبول نہیں کر سکتا جو یہودی آبادی کو اقلیت میں بدل دے گی۔ 2009 میں یکدم بشار الاسد عرب حکمرانوں کا پیارا بھتیجا بن گیا۔ سعودی شاہ نے دمشق کا دورہ کیا اور بشار کو کئی مرتبہ ریاض بلایا۔یہی رویہ دیگر عرب بادشاہوں کا تھا۔ بشار کو اعلی سرکاری ایوارڈ دیئے گئے۔یہ بشار کو پیار سے سمجھانے کی آخری کوشش تھی۔البتہ شام میں بیٹھے سیاسی امور کے ماہرین مشرق وسطیٰ میں ایسے ڈرامے کئی مرتبہ دیکھ چکے تھے۔ وہ اس پیار کے بدلے انور سادات جیسی غلطی دہرانے کو تیار نہیں تھے۔

دوسری جانب ترکی میں سن 2003 سے رجب طیب اردگان نامی اخوان المسلمون کے حامی کی حکومت تھی۔ منافقت میں پاکستانی جماعت اسلامی کو پیچھے چھوڑنے والے یہ حضرت بظاہر شریعت کے قوانین کے سب سے بڑے وکیل تھے۔ البتہ اس نے اسرائیل سے سفارتی اور تجارتی تعلقات پر حرف نہیں آنے دیا تھا جو کہ قرآن کی رو سے گناہ ہے۔ فلسطینیوں کیلیئے ان صاحب کی مدد فریڈم فلوٹیلا اور ٹاک شو سے واک آوٹ کرنے جیسے نمائشی اقدامات کی حد تک تھی، ایسے اقدامات جنہیں میڈیا میں پذیرائی مل سکے اور سالوں تک موسیقی کی دھنوں پر دکھایا جاسکے۔ آپ نے اپنے ملک میں معاشی استحکام برقرار رکھنے کیلیئے نہ کسی ساحل سمندر پر پردے کا انتظام کیا، نہ شراب اور جوئے کے مراکز بند کئے، مگر مشرق وسطیٰ میں نقشے بدلنے اور خلافت عثمانیہ کے احیا کیلیئے دل کو چھو لینے والی تقریریں کرتے رہے تھے۔ شام میں البتہ خلافت عثمانیہ کی یادیں اتنی اچھی نہیں تھیں، عثمانی بادشاہ کی فوج نے پہلی جنگ عظیم میں پندرہ لاکھ آرمینائی مسیحیوں کو قتل کیا تھا۔ ان بادشاہ سلامت نے عربوں پر ترکوں کو اہمیت دی تھی۔ علوی، شیعہ اور دروز، خلافت عثمانیہ کے خصوصی عتاب کا شکار رہے تھے۔ اخوان المسلمون کے سوا باقی شامی عوام کو اردگان کے خوابوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

باب چہارم: عرب بہار کا پس منظر

عرب بہار کا آغاز دسمبر 2010 میں تیونس کے ایک جوان کی خودسوزی سے ہوا، لیکن اس کے بعد اس نے جو رخ اختیار کیا وہ عرب دنیا کی حالیہ تاریخ نے متعین کیا۔ شام ہمیشہ سے اسرائیل میں فلسطینی مہاجرین کی واپسی اور اس زمین پر قدیم باشندوں اور یہودی مہاجرین کے درمیان انسانی برابری کی بنیاد پر نئے عمرانی معاہدے اور امن کے قیام کا وکیل رہا ہے۔ شام خود اسرائیلی جارحیت کا شکار ہو کر جولان جیسے اہم پہاڑی سلسلے سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ شام میں بعث پارٹی کی حکومت ہے جو قومی اور سوشلسٹ رجحانات کی مالک ہے۔ شام اور عراق بہت پرانے پڑوسی ہیں اور کم و بیش ہمیشہ ان کا جغرافیہ یہی رہا ہے۔ ان دونوں ممالک کے حالات ہمیشہ ایک دوسرے سے اثر لیتے رہے ہیں۔ عراق میں صدام کی حکومت بھی بعث پارٹی کی حکومت تھی، لیکن شام کی بعث پارٹی کے عراقی بعث پارٹی سے دشمنی کی حد تک اختلافات رہے ہیں۔ اس اختلاف کی بڑی وجہ صدام حسین کا رویہ اور ماضی ہے۔ شامی بعث پارٹی کے برعکس عراقی بعث پارٹی کی حکومت امریکی مفادات کے تحفظ کے لئے بنی تھی۔ عراق کی جنگ آزادی کا ہیرو جنرل قاسم روس نواز کمیونسٹ تھا۔ سی آئی اے نے 1963 میں ایک بغاوت کے ذریعے اسے قتل کروا کر جنرل عارف کو مسند اقتدار پر بٹھایا تھا۔ بعد کے سالوں میں عراق محلاتی سازشوں کی زد میں رہا اور آخر کار سن 1968 میں حکومت احمد حسن البکر کے ہاتھ میں آ گئی۔ صدام، جو بغاوت سے پہلے قاہرہ میں امریکیوں سے رابطے بنا چکا تھا، احمد حسن البکر کا دست راست تھا۔ 1976 میں صدام نے احمد حسن البکر کو بے دخل کر کے زمام حکومت خود سنبھال لی۔ تین سال بعد ایران سے امریکہ نواز شاہ کی حکومت کا خاتمہ ہوا تو یہ خدشہ پیدا ہوا کہ خطے کی باقی امریکہ نواز حکومتوں کو بھی عوامی انقلاب کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ اب امریکہ کے لئے اس لہر کو روکنا ضروری تھا اور اس کا حل ایک طرف اس انقلابی لہر کو سیاسی کے بجائے شیعہ سنی فرقہ واریت کا رنگ دینا تھا تو دوسری طرف امریکہ کو ایک مرتبہ پھر عراقی بعث پارٹی کی ضرورت تھی۔ عراق نے امریکی آشیر باد سے ایران پر حملہ کر دیا۔ ادھر شام میں ہنری کسنجر کی شٹل ڈپلومیسی ناکام رہی تھی، حافظ الاسد فلسطینی مسلمانوں کو برابر کے شہری حقوق ملے بغیر اسرائیل سے امن معاہدہ کرنے سے انکاری تھا۔ حافظ الاسد نے ایران میں امریکہ مخالف تبدیلی کی شکل میں ایک اہم اتحادی دیکھ لیا تھا۔ وہ اپنی سیاسی بصیرت کی بدولت علاقے کے حالات کے آپس میں تعلق کا گہرا شعور رکھتا تھا۔ یہاں سے اسد خاندان اور صدام میں مخالفت کا آغاز ہوا۔

ایران جلد ہی جنگ میں غالب ہونے لگا تھا۔ ایرانی حکومت نے عوام کو مسلح کر دیا تھا اور اب اس کا مقصد عراق میں کمبوڈیا کے پول پاٹ کے ساتھ ویتنام کی فوج کے سلوک کو دہرا کر عراق میں ایک امریکہ مخالف حکومت کا قیام تھا۔ صدام کو بچانے کیلئے امریکہ، ہالینڈ اور جرمنی نے صدام کو کیمیائی ہتھیار بنانے کی ٹیکنالوجی منتقل کی۔ محاذ جنگ پر شکست

سے بچنے کیلئے صدام نے 1983 سے 1988 تک متعدد مرتبہ کیمیائی ہتھیار استعمال کئے جن کے خلاف عالمی اداروں میں کوئی رد عمل دیکھنے کو نہیں آیا۔ یہ ہتھیار بنیادی طور پر زہریلی گیس کے سلنڈرز پر مشتمل ہوتے ہیں۔ پھٹنے کے بعد وہ گیس کثیف ہونے کی وجہ سے سطح زمین کے قریب رہتی ہے۔ متاثرہ مقام کے قریب سانس لینے والے افراد فوری موت کا شکار ہو جاتے ہیں لیکن وہ افراد جو تھوڑے دور ہوتے ہیں یا حملے کے بعد مردہ جسموں کو مخصوص دستانوں اور ماسک کے بغیر چھوتے ہیں، وہ معذور ہو جاتے ہیں۔ گیس کے اثرات ان کے جسموں میں دیر تک رہتے ہیں۔ کیمیائی بم عام بارودی بم جیسا نہیں ہوتا جس کے ٹکڑے بکھرنے کے بعد خطرہ ٹل جائے، بلکہ اس سے نکلنے والی کثیف گیس کا زہر کئی دنوں تک فضا میں رہتا ہے اور قریب وجوار کے لوگوں کے پھیپھڑے ناکارہ کرتا رہتا ہے۔ اگر کسی مقام پر کیمیائی حملے کی خبر آئے مگر وہاں سے لوگوں کو علاقہ خالی کرنے کا نہ کہا جائے اور متاثرین کو اٹھانے والے لوگوں نے حفاظتی لباس نہ پہنا ہو تو یہ خبر جعلی ہے اور ویڈیو اداکاری سے زیادہ کچھ نہیں ہے، کیونکہ ایسی بے احتیاطی کے بعد ہزاروں اموات ہونا یقینی ہوتا ہے۔ صدام کے کیمیائی حملوں کی وجہ سے تقریباً پچاس ہزار ایرانی جان بحق اور ایک لاکھ کے قریب مختلف بیماریوں کا شکار ہو کر معذور ہوئے۔ ایک ہزار کے لگ بھگ افراد شدید معذوری کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے ہسپتالوں میں منتقل ہوئے۔ صدام نے بعد میں حلبجہ میں کرد سنی عوام کی بغاوت کو کچلنے کے لئے بھی اسی گیس کو استعمال کیا جس کے نتیجے میں پانچ ہزار انسان لقمہ اجل بن گئے اور وہ قصبہ کھنڈر کا منظر پیش کرنے لگا۔

یہ سب جنونی اقدامات صدام حسین کی کوتاہ نظری اور تشدد پسند نفسیات کا اظہار تھے۔ ڈکٹیٹر ہمیشہ طاقتور کے سامنے بھیگی بلی اور کمزوروں پر شیر ہوتا ہے۔ ایران کے انقلاب کے اثرات کو صدام اور فرقہ پرست تنظیموں کی مدد سے روکنے کے بعد امریکہ نے علاقے کے جغرافیے کو بدلنے کے منصوبے تیار کرنے شروع کر دیئے تاکہ متعدد چھوٹے چھوٹے ممالک کی تشکیل سے علاقے کی صورت حال کو چند مضبوط حکومتوں کے بجائے متعدد کمزور حکومتوں کے حوالے کیا جا سکے۔ صدام نے ایران کے بعد امریکی آشیر باد سے کویت پر حملہ کر دیا۔ کویت کی حکومت بھی صدام کی طرح امریکہ نواز تھی۔ امریکہ نے صدام کو آسانی سے پھندے میں پھانس لیا تھا۔ میڈیا پر مشہور کیا گیا کہ عراقی فوجیوں نے کویت کے ایک ہسپتال میں آکسیجن پر لگے نومولود بچوں کو نکال پھینکا ہے۔ بھلا تربیت یافتہ عراقی فوج ایسی بربریت کیوں کرتی؟ لیکن یہ افواہ امریکی حکومت کو عوامی حمایت فراہم کرنے کے لئے کافی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس جھوٹی خبر کو میڈیا پر بیان کرنے کے لئے جس پندرہ سالہ لڑکی نیرہ الصباح کو ہسپتال کی نرس اور اس حادثے کی عینی گواہ بنا کر پیش کیا گیا تھا وہ اس وقت امریکہ میں موجود کویتی سفیر کی بیٹی تھی۔ امریکا نے سعودی عرب کی سرزمین کو استعمال کر کے عراق پر شدید حملہ کیا۔ اس حملے میں امریکہ نے عراقی فوج کو کمزور کیا اور صدام کو مجبور کیا کہ وہ 1991 میں کیمیائی ہتھیار عالمی اداروں کے حوالے کرے۔ ظاہر ہے کہ اس ٹیکنالوجی کا مقصد پورا ہو جانے کے بعد اس کے عراق کے پاس رہنے دینے

کی کوئی وجہ نہ تھی۔ ویتنام کی جنگ سے امریکی انتظامیہ نے یہ سبق سیکھا ہے کہ امریکی عوام ایسی جنگ کے خلاف ہوتی ہے جس میں امریکی جانوں کا بہت زیادہ ضیاع ہوتا ہو۔ عراق کے پاس کیمیائی ہتھیار موجود ہونے کی صورت میں علاقے کا نقشہ بدلنے کے لئے کی جانی والی کسی بھی فوجی مداخلت کو بہت زیادہ جانی نقصان اٹھانا پڑ سکتا تھا لہٰذا آٹھ سال قبل دی جانے والی ٹیکنالوجی کو ختم کرنے کی کوشش شروع کر دی گئی۔

عراق کی طرف سے کیمیائی ہتھیار عالمی اداروں کے حوالے کیے جانے اور ایران و کویت پر حملوں کے بعد عراقی فوجی قوت میں کمی کے باوجود امریکہ نے عراق میں فوجی مداخلت کرنے میں نہایت احتیاط سے کام لیا۔ عراق پر شدید اقتصادی پابندیاں عائد کر کے اس کی طاقت کا آخری قطرہ نچوڑا گیا۔ امریکی وزیر خارجہ میڈلین البرائٹ سے جب کہا گیا کہ آپ کی پابندیوں کی وجہ سے عراق میں لاکھوں بچے ادویات کی عدم دستیابی کا شکار ہو کر فوت ہو چکے ہیں تو انہوں نے اسے کسی عظیم مقصد کیلئے ادا ہونے والی جائز قیمت قرار دیا۔ سن 2003 میں جب امریکا نے عراق پر دوبارہ حملے کا فیصلہ کیا تو امریکی حملے سے پہلے عرب لیگ کا ایک اجلاس ہوا جس کا مقصد عراق پر ممکنہ حملے کے حوالے سے فیصلے کرنا تھا۔ شامی صدر بشار الاسد صدام کا مخالف تھے لیکن اسکی تقریر عراق پر حملے کی مخالفت پر مبنی تھی۔ اس تقریر کا ایک اہم اقتباس درج ذیل ہے:۔

"آج ہم سب عراق کو درپیش خطرے کو دیکھ رہے ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہم اس خطرے کی گہرائی کو پوری طرح بھانپ نہیں رہے۔ آج عراق میں جو کچھ ہونے جارہا ہے یہ 1917 کے اعلان بالفور اور 1948 میں اسرائیل کے قیام کی طرح کا اہم واقعہ ہے۔ آج کا ہمارا مل بیٹھنا اس حوالے سے بہت خاص ہے، یہ وقت بہت خاص ہے اور غیر معمولی فیصلوں کا تقاضا کرتا ہے۔ ہمیں بہادری کا مظاہرہ کرنا ہو گا اور ذاتی میلانات اور اختلافات سے دور ہونا ہو گا۔ آج جو کچھ ہو رہا ہے یہ 1990 میں صدام کے کویت پر حملے کا تسلسل ہے۔ عرب ممالک کو ہدف بنانے والا وہ منصوبہ جاری وساری ہے۔ آج کے حالات اور اس وقت کے حالات میں فرق یہ ہے کہ اس وقت کویت پر قبضہ کیا گیا تھا جبکہ آج عراق نے کسی ملک پر قبضہ نہیں کیا ہے۔ میں صدام حسین کو ذاتی طور پر نہیں جانتا نہ کبھی اس سے میری بات ہوئی ہے۔ ماضی میں شام اور عراق کی حکومتوں میں بہت اختلاف بھی رہا ہے۔ یہ بتانا اس لیے ضروری ہے تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں جو کچھ کہنے جارہا ہوں یہ کسی ذاتی قربت کی وجہ سے ہے۔ ایسا نہیں ہے، میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ از روئے بصیرت کہہ رہا ہوں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ مسئلہ عراق کی حکومت یا کسی شخص کا نہیں ہے۔ شروع میں امریکیوں نے اعتراض کیا کہ عراقی حکومت نے ہتھیاروں پر نظر رکھنے والے بین الاقوامی انسپکٹروں کو نکال دیا ہے، عراق نے بین الاقوامی قوانین کی

روشنی میں ان انسپکٹروں کی واپسی پر رضامندی ظاہر کر دی۔ اس کے بعد بات سیکورٹی کونسل کی قراردادوں کے نفاذ پر آ گئی۔ پھر کیمیائی ہتھیاروں کی تباہی کا راگ الاپا گیا (جو 1991 میں ہی تباہ کئے جا چکے تھے)۔ پھر جمہوریت اور انسانی حقوق کی بات آ گئی۔ اور آج کل وہاں عراق پر حملے کے بعد تعمیر نو کے منصوبوں (سے مال بنانے) کی تیاری ہو رہی ہے۔ یہ سب چیزیں حقیقت پر پردہ ڈالنے کیلئے تیار کئے گئے نقاب ہیں۔ حقیقت میں یہ علاقے کو کنٹرول کرنے کا منصوبہ ہے۔ یہ منصوبہ اس علاقے کے جغرافیے کو اپنے مفادات کے تناظر میں بدلنے کا منصوبہ ہے۔ وہ ہتھیاروں کو تباہ کرنے کے بارے میں بات کرنے کے بجائے عراق کی تعمیر نو کے بارے میں بحث کر رہے ہیں، منصوبہ موجودہ عراق کو تباہ کر کے دوبارہ اپنی مرضی کے مطابق تعمیر کرنا ہے۔ وہ ایسی قوم بنانا چاہتے ہیں جن کا جسم زندہ ہو مگر ان کا دماغ کسی اور کے ہاتھوں میں ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ عراق کے ہتھیاروں سے عرب اقوام کو خطرہ ہے، اگر وہ ہمارے بارے میں اتنے ہی فکر مند ہیں تو اسرائیل کو فلسطینیوں کے کم رفتار سے جاری سلسلہء قتل سے کیوں نہیں روکتے؟ وہ ہمارے ہتھیار اس لیے لینا چاہتے ہیں تاکہ اسرائیل ہمارے علاقے میں من مانی کر سکے۔ جہاں تک جمہوریت کی بات ہے تو ہمارے علاقے میں اگر کوئی شخص امریکی پالیسی سے اختلاف کرے تو وہ ڈکٹیٹر ہے لیکن اسرائیل اگر فلسطینیوں کے شہری و انسانی حقوق غصب کرے اور معمولی سے احتجاج پر ہزاروں کو جیل میں پھینک دے تو وہ پھر بھی جمہوری ملک ہے۔

عراق کے موجودہ حالات کا مسئلہ فلسطین سے گہرا تعلق ہے۔ اگر ہم یہاں ناکام ہوتے ہیں تو اس کا اثر فلسطین پر بھی پڑے گا۔ یہ حملہ اسرئیلیوں کے جرائم کو پردہ فراہم کرے گا۔ انہیں یہ موقع ملے گا کہ وہ مزاحمت کی تحریکوں (حماس اور حزب اللہ) کا محاصرہ کر سکیں۔ یہ چیز آخر میں ان کے دیرینہ مقصد کی طرف بڑھے گی جو کہ ہم پر اسرائیلی منشا سے مطابقت رکھنے والا امن معاہدہ تھوپنا ہے۔ اس کا ایک نتیجہ عراق کی (کمزور اور چھوٹے ٹکڑوں میں) تقسیم بھی ہو سکتا ہے۔ جغرافیے کی تبدیلی کے اس عمل کے دوران اسرائیل اپنے وجود کا جواز حاصل کرنے کی کوشش بھی کر سکتا ہے۔ جب اسرائیل کے نواح میں متعدد چھوٹے چھوٹے ممالک ہوں گے تو وہ بھی (اپنے نسلی امتیاز کی بنیاد پر قائم وجود کیلئے) سیاسی اور معاشرتی جواز حاصل کر لے گا۔ لہٰذا جب ہم عراق کی بات کرتے ہیں تو ہمیں شام، فلسطین اور لبنان کے عوام کو بھی یاد رکھنا ہو گا جو اس سازش کا نشانہ بننے جا رہے ہیں۔ ہمیں فلسطینی عوام کے حقوق کے سلسلے میں منظور کی جانے والی اقوام متحدہ کی قراردادوں کو بھی پردے کے پیچھے جانے سے روکنا ہے۔ ہمیں مزاحمت کی قوتوں کو ان کی منشا کے مطابق مدد بھی فراہم کرنی ہے

اور فلسطینی مہاجرین کی اپنے آبائی علاقوں میں واپسی کو بھی نہیں بھولنا ہے۔ ہمیں اس موقف پر بھی باقی رہنا ہے کہ جب تک انصاف پر مبنی امن معاہدہ نہیں ہوتا، ہم اسرائیل سے کسی قسم کا سیاسی یا اقتصادی رابطہ نہیں رکھیں گے۔ ہمیں اس جنگ کو روکنا ہے اور ہم مل کر ایسا کر سکتے ہیں۔ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو ہماری آنے والی نسلیں یہ کہیں گی کہ جب عربوں پر حملہ ہوا تو انہوں نے کچھ نہیں کیا۔ آج کسی ایک قوم پر حملہ نہیں ہو رہا بلکہ یہ حملہ سب پر ہو رہا ہے"۔

بشار الاسد کی اس تقریر کی اہمیت دس سال بعد اس وقت واضح ہوئی جب شام اور عراق میں داعش کے ظہور کے بعد مغربی دنیا کی جانب سے عراق کو شیعہ، سنی اور کرد حصوں میں تقسیم کرنے اور شام کو علوی، دروز، سنی، اور کرد حصوں میں تقسیم کرنے کا مطالبہ زور و شور سے کیا جانے لگا۔

باب پنجم: شام اور عراق کی تقسیم کی سازش

عراق پر امریکا کا حملہ یکدم نہیں ہوا تھا۔ تاریخ کے ہر اہم واقعے کی طرح اس کا بھی ایک پس منظر اور مقصد تھا جس کا بیان سابقہ ابواب میں کیا جا چکا ہے۔ بڑی ریاستیں تاریخ پر گہری نظر رکھتی ہیں اور ان کے ادارے اپنے مفادات کیلئے منصوبہ بندی کئے بغیر کسی معاملے میں نہیں پڑتے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ منصوبے ہمیشہ کامیاب نہیں ہوتے کیوں کہ کسی بھی ریاست کے پاس لا متناہی طاقت نہیں ہوتی۔ طاقتور افراد اور اداروں کے زیر اثر میڈیا پر بھی کچھ مسائل پر بہت زیادہ زور بلا وجہ نہیں دیا جاتا ہے۔ عرب بہار کے زمانے میں شام کے بحران کو بہت زیادہ میڈیا کی توجہ ملی ہے جبکہ اس کے ہم عصر بحرانوں کو بہت کم توجہ ملی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو بحرین میں چھ سال سے عدم تشدد پر مبنی تحریک چل رہی ہے۔ یہ ایسی تحریک ہے جس میں جمہوری حقوق کے خواہشمند حضرات نے اسلحہ نہیں اٹھایا ہے۔ مغربی میڈیا اگر مشرق وسطیٰ کیلئے جمہوری اور انسانی حقوق کی حمایت کرنا چاہے تو اس تحریک سے زیادہ صاف ستھری تحریک اور کوئی نہیں تھی، لیکن بحرین کے شاہی خاندان کی امریکا نوازی نے اس تحریک کو پردہ سکرین سے گم کر رکھا ہے۔ اسی طرح افریقہ کے ملک مالی کے مغربی علاقے آزاواد میں آزادی کی تحریک چل رہی ہے۔ یہ لوگ پڑوسی ملک لیبیا میں عرب بہار سے متاثر ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ یہ القاعدہ کے خلاف بھی لڑے اور مالی کی حکومت کے خلاف بھی، لیکن آپ کو تعجب ہوگا کہ جس فرانس نے لیبیا میں باغیوں کی حمایت کی، اسی فرانس نے مالی میں جمہوریت و آزادی پسند لوگوں کے خلاف فوجی آپریشن کیا ہے۔ یہی صورت حال یوکرین کی ہے، وہاں روسی نسل کے باشندوں نے اپنی آزادی کا اعلان کر رکھا ہے۔ چونکہ یوکرین کی حکومت امریکا اور یورپی یونین کی کٹھ پتلی ہے، مغربی میڈیا ان کی حمایت نہیں کر رہا۔ امریکا ان لوگوں کو کچلنے کیلئے یوکرین کی حکومت کو پولینڈ اور بالٹک ریاستوں کے راستے سے بے پناہ اسلحہ فراہم کر رہا ہے اور روس کے بارڈر کے ساتھ اپنی فوج بھی لے آیا ہے۔ مغربی میڈیا پر ان واقعات کو چھپانے کا عالم یہ ہے کہ جب کچھ لوگوں نے اس نقل و حمل کی ویڈیو بنا کر یوٹیوب پر لگائی تو انھیں ان کے ملک کی پولیس پکڑ کر لے گئی۔ عراق اور شام میں حکمرانوں کی نسلی اور مذہبی وابستگیوں پر اعتراض کرنے والے مغربی میڈیا نے امریکی صدر اوباما کے اقلیتی سیاہ فام نسل سے تعلق پر کبھی اعتراض نہیں کیا۔

شام اور عراق کے بارے میں اصلی منصوبہ ان دو ملکوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کا ہے اور خون بہائے بغیر نئی ریاستیں قائم نہیں ہو سکتیں۔ ان منصوبے کے مطابق شام کو علوی، دوروز، سنی اور کرد ممالک میں تقسیم کرنا ہے۔ علوی ساحل سمندر کے پہاڑی علاقے میں رہتے ہیں جہاں انھیں خلافت عثمانیہ کی طرف سے امتیازی سلوک سے پناہ ملی تھی۔ یہ علاقے کشمیر کی طرح شام کی شہ رگ ہیں۔ یہاں سے زراعت اور گھریلو استعمال کیلئے درکار پانی آتا ہے۔ یہیں شام کی

بندر گاہیں موجود ہیں جن کی مدد سے ساری دنیا سے تجارت ہوتی ہے۔ دوروز علاقہ دمشق کا علاقہ ہے، یہ بھی سرسبز علاقہ ہے اور اس کے ساتھ اسرائیل کا بارڈر ہے، یہ علاقہ عسکری اہمیت کا حامل بھی ہے۔ سنی اکثریت کا علاقہ شام کا مرکزی علاقہ ہے جہاں صحرا پایا جاتا ہے، یہ کسی اسرائیلی حملے کی صورت میں دوروز اور علویوں کی پناہ گاہ ہے۔ یہاں شام کی تاریخ اور ثقافت کے مراکز بھی ہیں۔ شام کے شمال کو کردستان نامی مجوزہ ملک میں شامل کرنے کا منصوبہ ہے، یہاں کرد بھی رہتے ہیں لیکن یہاں اکثریت مسیحی اور سنی عربوں کی ہے۔ شمالی شام میں ہی تیل کے ذخائر موجود ہیں، جو اگرچہ بہت بڑے نہیں مگر شامی کی ضرورت کیلئے کافی ہیں۔ گویا نہ صرف یہ حصے ایک مشترک تاریخی ورثہ رکھتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کے بغیر انکی بقا ممکن نہیں ہے۔ تقسیم کی صورت میں یہ ریاستیں ہر وقت تنازعات میں الجھی رہیں گی۔

ایسی ہی صورت حال عراق کی ہے۔ عراق کے شمال میں بھی کرد رہتے ہیں۔ منصوبے کے مطابق مشرقی عراق شیعوں کو، مغربی سنیوں کو اور شمالی کردوں کو دیا جانا ہے۔ کرد بھی سنی ہیں اور ان میں ہر قسم کے سنی پائے جاتے ہیں۔ بعض کرد کمیونسٹ ہیں تو بعض اتنے شدت پسند مذہبی کہ داعش کے رکن ہیں۔ لیکن آج کل جہاں مغرب ہر کسی کا مسلک پوچھ رہا ہے، وہیں مغربی میڈیا کردوں کی قومیت پر زور دیتا ہے۔ (اگرچہ یہی قوم پرستی والا فارمولا یوکرین کے روسی نسل کے لوگوں پر لاگو نہیں کیا جارہا، نہ ہی سیاہ فام امریکیوں کیلئے الگ ملک بنانے کا کوئی منصوبہ کسی رسالے کی زینت بن سکا ہے)۔ کرد بنیادی طور پر ترکی اور ایران کے بدو ہیں جو خانہ بدوش ہوا کرتے اور بھیڑ بکریاں چراتے تھے۔ یہ لوگ ترکی کے صوبے سرناک اور ایران کے ضلع کردستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب بعض کرد قوم پرست سیاست دان ترکی اور ایران سے الگ ہو کر نسلی امتیاز پر مبنی اسرائیل نما ریاست "کردستان" تشکیل دینا چاہتے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم میں جب خلافت عثمانیہ نے شامی اور عراقی مسیحیوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی مہم چلائی تو ان قبائلی افراد کو ساتھ ملا کر شریک جرم کیا گیا۔ اس مہم میں پندرہ لاکھ آرمینی مسیحی مظلومیت کی موت مارے گئے۔ ماضی میں ان لوگوں کو روسی حمایت حاصل رہی ہے اور شاہ ایران اور ترکی کی نیٹو اتحادی حکومت ان کی بغاوت کو کچلتی رہی ہے۔ سوویت یونین کے زوال کے بعد اس علاقے کیلئے بنائے جانے والے تقسیم کے منصوبے کی وجہ سے اب انہیں امریکی حمایت بھی حاصل ہو گئی ہے۔

شام اور عراق میں جنگ عظیم اول کے دوران جن علاقوں میں ان لوگوں کو بھیجا گیا وہاں عرب اکثریت میں تھے۔ شام اور عراق میں رہنے والے کرد یہاں کے قدیم باشندے نہیں ہیں اور اسی وجہ سے اقلیت ہیں۔ اگر ان علاقوں کو کردستان میں شامل کیا جانا ہے تو یہاں کے عربوں کو ان کے گھروں اور زمین سے محروم کرنا ہو گا۔ یہ ویسا ہی نسلی صفایا ہے جو فلسطین میں اسرائیل کے قیام سے پہلے انجام پایا تھا۔ ہمارے بہت سے لبرل لوگوں کیلئے یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے کیوں کہ ویڈیو گیم کھیلتے ہوئے انھیں آبادیوں کی نقل و حمل میں کبھی کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ لیکن حقیقی دنیا ویڈیو گیم سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ یہ مہاجرین جس زمین پر جاتے ہیں وہ کسی اور آبادی کا مادی سرمایہ ہوتی ہے۔ کسی بھی

آبادی کیلئے چند ہزار سے زیادہ انسانوں کو جذب کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اور یہاں لاکھوں لوگوں کو بے گھر کیا جارہا ہے۔ کرد پیشمرگہ جب ان علاقوں میں آگئے تو انہوں نے مسیحی، سنی اور ایزدی لوگوں سے تمام اسلحہ لے لیا اور کہا کہ ہم آپ کی حفاظت کریں گے۔ لیکن جب داعش نے حملہ کیا تو یہ لوگ جان بوجھ کر پیچھے ہٹ گئے تاکہ وہ ان علاقوں میں دہشت پھیلا کر مقامی باشندوں کو نکال سکیں۔ اب جب داعش کو شکست ہو رہی ہے تو ان مقامی باشندوں کی واپسی کا راستہ روکا جارہا ہے۔ بہت سے علاقوں میں تو کرد پیشمرگہ نے خود نسلی صفایا کیا اور مقامی افراد کو نکالا ہے۔

تقسیم کے منصوبہ سازوں کیلئے سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ یہاں مختلف مذاہب، نسلوں اور مسالک کے لوگ صدیوں سے ساتھ ساتھ رہ رہے ہیں۔ بات صرف ایک دوسرے کو ضرورت کے تحت برداشت کرنے کی نہیں ہے، بلکہ پورے عالم اسلام میں بین المسالک شادیوں کا رواج عام ہے۔ خانہ جنگی کیلئے ضروری تھا کہ امریکا کسی ایک ریاست کے ڈھانچے کو تباہ کرتا، اور اس مقصد کیلئے عراق کا انتخاب ہوا جس کے کیمیائی ہتھیار 1991 میں تباہ کئے جاچکے تھے اور صدام جیسے احمق اور ذہنی مریض نے خود کو سب پڑوسی ممالک کا دشمن بنالیا تھا۔ صدام کی حکومت گرنے کے بعد عوامی حکومت کے قیام کے بجائے امریکا نے وہاں ٹھہر کر تقسیم کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔ صدام کے زمانے میں اہم سرکاری نوکریاں صدام کے اپنے علاقے سے تعلق رکھنے والے حضرات کو ملی تھیں جو تکریت اور موصل کا سنی نشین علاقہ ہے۔ امریکہ نے عراق کو تباہ کرنے کیلئے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ عراق کی فوج کے تربیت یافتہ افسروں اور اہلکاروں کو، جن کی تربیت پر عراقی عوام کا سرمایہ خرچ ہوا تھا، صدام کی فوج کہہ کر نوکریوں سے نکال دیا۔ یہ لوگ جنھیں جنگ کے سوا کوئی کام نہیں آتا تھا، بے روزگار کر دیئے گئے۔ بعد میں جب داعش نے ان کو تنخواہیں پیش کیں تو یہی لوگ اسکی جنگی حکمت عملی کو ترتیب دینے اور جنگ لڑنے کے کام آئے۔ اس سلسلے میں سب سے دوسرا کام القاعدہ کو کھلی چھوٹ ملنا تھا جنہوں نے القاعدہ کی عراقی شاخ کی بنیاد رکھی۔

امریکا اس وقت تک عراق سے نکلنا نہیں چاہتا تھا جب تک اس ملک کو خانہ جنگی کیلئے پوری طرح تیار نہ کرلے۔ عراق کے شیعہ حضرات کے احساس محرومی کو استعمال کر کے ان میں فرقہ وارانہ تعصبات کو ہوا دی گئی۔ آیت اللہ باقر الحکیم جیسے معتدل اور صاحب مطالعہ شیعہ علماء قتل ہوئے اور مقتدی الصدر جیسے شیعہ فرقہ پرستوں کو کھلی چھوٹ ملی۔ چونکہ عراق میں شیعہ حضرات کی اکثریت تھی لہٰذا انتخابات میں شیعہ سیاست دان نوری المالکی کو کامیابی ملی۔ یہ صاحب امریکا کے کٹھ پتلی تھے۔ انہوں نے سنیوں کو نوکریوں سے محروم کیا اور ہر جگہ مسلکی تعصب کی بنیاد پر شیعہ افسروں کو لگایا۔ ان کی حکومت میں کرپشن کی کہانیاں بھی زبان زد عام ہوئیں۔ ایسے میں امریکی انٹیلی جنس کی ناک تلے القاعدہ خوب پلی بڑھی اور شیعہ سنی مخالف جذبات کو خوب ہوا ملی۔ اگر آپ کو یاد ہو تو اسی عرصے میں شیعہ ہلال کا بہت ذکر شروع ہوگیا تھا۔ مشرق وسطیٰ کے بارے میں شیعہ سنی کی بنیاد پر بات ہونے لگی۔ پہلے یہ سوال کبھی اٹھایا ہی نہیں گیا تھا کہ کون شیعہ

ہے کون سنی؟ آخر اس چیز کی اہمیت ہی کیا ہے؟ پہلی مرتبہ بڑے پیمانے پر من وتو کا سوال کھڑا ہو گیا، ہزاروں سال ایک ساتھ رہنے والے اجنبی بتائے جانے لگے۔ مختلف میڈیا چینل پر شیعہ سنی مناظرے ہونے لگے۔ چودہ سو سال پرانے آباءواجداد کے معمولی اختلافات کو اچھالا جانے لگا۔ وصال اور فدک جیسے چینل وجود میں آ گئے۔ تاریخ کی نبض میں آنے والی تیزی سے بے خبر شیعہ اور سنی آرام سے سو رہے تھے اور خون آشام جنگ انکی طرف بڑھ رہی تھی۔

باب ششم: شام میں آگ اور خون

امریکی خواہشات کے مطابق جدید مشرق وسطیٰ کا منصوبہ تیار تھا اور اسے بروئے کار لانے کیلئے صرف ایک بہانے کی تلاش تھی۔ اس جراحی کے عمل کا اوزار سوشل میڈیا نے ہونا تھا، اور جعلی یا اصلی حادثات کی ویڈیو بنانے سے لے کر اسلحہ استعمال کرنے اور معاشروں کی اجتماعی نفسیات سے کھیلنے کیلئے اخوان المسلمون نامی تنظیم کو منتخب کیا گیا تھا۔ یہ تنظیم گزشتہ سو سال سے عرب ممالک میں اسلام کے نام سے اقتدار کے حصول کی کوشش کر رہی ہے مگر اپنے کارکنان کے کردار کی وجہ سے عوام میں منفور رہی ہے۔ اس تنظیم کا نظریاتی مرشد سید قطب نامی مصری لکھاری ہے جس نے سیاسی تبدیلی کیلئے فتح مکہ جیسے پر امن عوامی مارچ کے بجائے روس، چین اور کیوبا کی طرح اسلحے کے زور پر اقتدار کے حصول کو اپنی تعلیمات کا مرکزی خیال بنایا۔ اس انحراف کو اگرچہ جامعہ الازہر جیسے اسلامی مراکز میں زیادہ پذیرائی نہیں ملی لیکن یہ تصور گاؤں کے پس منظر والے کم علم جوانوں کو دہشتگردی کی طرف راغب کرنے کا باعث بنا اور ہمیشہ سے غیر ملکی ایجنسیوں کیلئے ایک سرمایہ ثابت ہوا۔ یہ لوگ خوارج کی طرح جھوٹ، دھوکہ، تکفیر مسلمین اور قتل جیسے گناہوں کو اپنے تیئں نیک مقاصد کے حصول کا وسیلہ سمجھنے لگے ہیں۔ موجودہ زمانے میں سوشل میڈیا کی ایجاد اور فلم سازی کے جدید سافٹ ویئرز نے اس کام کو اور آسان بنا دیا ہے۔

17 دسمبر 2010 کو تیونس میں محمد بوعزیزی نامی ایک ریڑھی بان نے غربت اور حالات زندگی سے تنگ آکر خود سوزی کر لی۔ ایسے واقعات تمام ممالک میں اکا دکا پیش آتے رہتے ہیں لیکن یہ واقعہ یکدم میڈیا اور سوشل میڈیا پر عرب دنیا میں جمہوری انقلاب کے نقطۂ آغاز کے طور پر پیش کیا جانے لگا۔ عوام کو خوشحالی کی نوید سنانے والے کئی سوشل میڈیا اکاؤنٹ ہڑتالوں اور مظاہروں کی اپیل کرنے لگے۔ دو دن بعد پورے تیونس میں مظاہرے ہونے لگے اور اخوان المسلمون ان مظاہروں کے منتظمین کے طور پر سامنے آ گئے۔ سن 2011 کے آغاز کے ساتھ مصر، الجزائر، لیبیا، مراکش، شام، بحرین اور یمن میں بھی مظاہرے شروع ہو گئے۔ یہی وہ دن تھے جب پاکستان میں جماعت اسلامی کے امیر سید منور حسن اپنی جماعت کے کارکنوں کو تیار رہنے کی تلقین کرتے نظر آئے۔ پچھلے عشرے میں برائن ڈی ہنٹ جیسے امریکی سفارت کاروں سے جماعت اسلامی کے رہنماؤں کی ملاقاتیں اخبار کی زینت بنتی رہتی تھیں۔ جماعت اسلامی نے بھی ایک سوشل میڈیا ونگ تشکیل دیا۔ البتہ تمام تر کوشش کے باوجود اس سوشل میڈیا ٹیم کو ناکامی ہوئی اور آخر کار مایوس ہو کر 23 نومبر 2014ء کو سید منور حسن نے قوم کی سیاسی قیادت کے قتل کو ضروری قرار دیتے ہوئے کہا کہ پاکستان میں قتال فی سبیل اللہ کے "کلچر" کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں سبیل اللہ سے مراد اسلام کی

جماعت اسلامی والی تعبیر ہی تھی۔ اس مایوسی کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ انقلاب کے نام پر بنائی گئی اس سوشل میڈیا ٹیم کا کام مختلف فرقوں اور سیاسی جماعتوں کے خلاف بھڑاس نکالنا اور نفرت پھیلانا رہ گیا ہے۔

تعجب کی بات ہے کہ جس وقت ساری دنیا میں عرب بہار کا چرچہ تھا اس وقت امریکا کے دوست عرب ممالک میں سے سوائے مصر کے کہیں یہ بہار نہ پہنچی۔ مصر کو اس لیے بھی اس بہار میں شامل ہونا تھا کیوں کہ مصر ہی عرب دنیا میں اخوان المسلمون کا مرکز تھا۔ باقی امریکا نواز حکومتوں، جیسے سعودی عرب، کویت، اردن، مقبوضہ فلسطین اور ترکی کے خلاف اگر کوئی مظاہرے ہوئے بھی تو ان پر جلد قابو پالیا گیا اور عالمی میڈیا نے مظاہرین کے خلاف حکومت کا ساتھ دیا۔ متحدہ عرب امارات، قطر اور عمان میں کوئی مظاہرے نہ ہوئے اور قطر اپنے چینیل الجزیرہ اور اپنی دولت کے ہمراہ اس فتنے میں حصہ ڈالنے لگا۔ مسلمان ممالک میں تاریخ اور سماج کا صحیح مطالعہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ غلط فہمی عام ہے کہ غربت کو دور کرنے کیلئے محض سیاسی تبدیلی کافی ہے اور یہ کہ چند دنوں میں کسی زحمت کے بغیر انھیں بنی بنائی جنت مل سکتی ہے۔ تیونس اور مصر کے عوام جلد اس جھانسے میں آگئے اور اقتدار اخوان المسلمون کے ہاتھوں میں چلا گیا اور تبدیلی کچھ عرصے بعد ہی ایک سراب ثابت ہوئی۔ یمن میں علی عبداللہ صالح کی جگہ عبدالرب منصور ہادی کی نگران حکومت قائم ہوئی جس کے ذمے تین سال کے اندر اندر انتخابات کروانے کا کام تھا مگر اس نے یہ کام نہ کیا۔ تین سال کی معیاد پوری ہونے کے بعد عوام نے دوبارہ احتجاج کیا تو منصور ہادی انتخابات کروانے کے بجائے سعودی عرب فرار کر گیا اور سعودی عرب نے یمن پر حملہ کر دیا جو تادم تحریر جاری ہے۔

لیبیا میں عرب بہار شروع ہونے کے کچھ عرصے کے بعد باغیوں کو مسلح کر دیا گیا۔ ہتھیاروں سے بھرے مغربی ممالک کے بحری جہاز ساحل پر آکر اسلحہ بانٹتے رہے اور ریاستی ڈھانچے کو نیٹو نے بمباری کے ذریعے تباہ کر دیا۔ اسلحے کی فراوانی نے ملک کو جنگل بنا دیا، کرنل قذافی قتل ہو گئے اور لیبیا سستے تیل اور افریقی غلاموں کی منڈی کے طور پر سامنے آیا۔ کسی بھی ملک میں اس طرح اسلحہ بانٹنے کا یہی انجام ہونا تھا۔ لیبیا کی موت نے ایران، چین اور روس کو یہ پیغام بھیجا کہ مشرق وسطیٰ میں عرب بہار کے نام پر نیا کولونیل دور شروع کیا جا رہا ہے اور اس نام نہاد بہار کی مہاریں کسی اور کے ہاتھ میں ہیں۔ یہ بہار معاشی اور سیاسی استحکام کی بہار نہیں بلکہ معاشی اور سیاسی غلامی کی سیاہ رات ہے۔

شام جو کہ اس فساد کا اصلی ہدف تھا، باقی ممالک سے بہت مختلف تھا۔ شامی عوام سیاسی شعور کے حساب سے کافی بلند تھے اور انکی حکومت ان کی خواہشات کی ترجمان ہونے کی وجہ سے مقبول تھی۔ اس وجہ سے اخوان المسلمون کو کبھی معاشرے میں قدم جمانے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ دوسرا بڑا فرق شام کا پاکستان کی طرح ایک کثیر الثقافتی ملک ہونا تھا۔ چونکہ اخوان المسلمون کسی دوسری ثقافت کیلئے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں رکھتی اس لیے یہ شام کے ٹکڑے کرنے

کیلیئے استعمال کی جاسکتی تھی۔ تیسرا فرق شام کی مضبوط فوج اور جاسوسی ادارے تھے۔اسرائیل کو تسلیم نہ کرنے کی وجہ سے شام ہر وقت سرد اور گرم محاذ پر جنگ کی حالت میں تھا اور اسکی فوجی طاقت نے ہی لبنان میں اسرائیل کے بڑھتے قدم روکے اور آخر کار اسکو پسپا کیا تھا۔چوتھا فرق شام کا امریکا کے بجائے روس اور ایران پر اعتماد کرنا تھا۔پانچواں فرق شام میں حافظ الاسد کے تربیت یافتہ مذاکرات کے ماہرین اور انتظامی منصوبہ ساز تھے جنہوں نے شام کے استقلال کی حفاظت کی تھی اور نازک حالات سے نبٹنے کا گر جانتے تھے۔یہ لوگ لبنان اور فلسطین کے محاذوں پر عملی تجربہ بھی حاصل کر چکے تھے۔چھٹا فرق شام کے پاس کیمیائی ہتھیاروں کی موجودگی تھی جو کسی امریکی حملے کی صورت میں امریکی افواج کی بڑے پیمانے پر ہلاکت کا باعث بن سکتی تھی۔

شام میں فروری 2011 میں فیس بک کی مدد سے انتشار کا آغاز کرنے کا سہرا سویڈن کے شہر سٹاک ہوم کے رہائشی فدا نامی شخص کے سر جاتا ہے۔اس نے شبکہ الشورہ السوریہ کے نام سے فیس بک کا پیج بنا کر عوام کو حکومت کے خلاف اکسانا شروع کیا۔البتہ باقی ممالک کے برعکس شام میں مظاہروں کا آغاز بڑے شہروں کے باشعور عوام کے بجائے بانیاس اور درعا کے قصبوں میں ہوا۔بانیاس میں شیخ انس العیروط نامی متشدد مولوی صاحب نے اپنے خطبے میں اس قسم کے مطالبات کو پیش کیا کہ ملک میں کوایجوکیشن کا خاتمہ کیا جائے اور خواتین اساتذہ کو چہرہ چھپانے کا پابند بنایا جائے۔یہ بالکل سوات کے صوفی محمد اور ملا فضل اللہ کی طرح کی سوچ تھی۔بانیاس کا قصبہ اس لیے چنا گیا تھا کیوں کہ یہ سمندر کے قریب تھا، لہٰذا مستقبل میں لیبیا کی طرز پر یہاں بحری جہاز لا کر اسلحہ بانٹا جاسکتا تھا۔نیز افریقہ سے الشباب اور بوکوحرام جیسی تنظیموں کے تربیت یافتہ دہشتگرد بھی بحری جہاز کی مدد سے داخل کئے جاسکتے تھے۔درعا اردن کی سرحد کے قریب ہونے کی وجہ سے ایک اور موزوں مقام کے طور پر چنا گیا تھا۔یہاں اردن سے اسلحہ اور عرب ممالک سے تعلق رکھنے والے القاعدہ کے دہشتگرد داخل کئے جاسکتے تھے۔

البتہ ان مظاہروں میں عوام کی شرکت جماعت اسلامی کی منظم کردہ ریلیوں سے زیادہ نہیں تھی جن میں ڈویژن بھر سے کارکنان کو اکٹھا کیا جاتا ہے۔شام میں اس قسم کے مظاہرے تو شروع ہو گئے مگر قاہرہ جیسے اجتماع کا دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔نیز ان مظاہروں میں کم شرکت سے مایوس ہو کر اخوان المسلمون کے کارکنان لوگوں کی گاڑیوں اور دکانوں کو آگ لگا دیتے جس سے شامی عوام ان سے مزید دور ہو جاتے۔

جب مقامی اخوان المسلمون کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہ کر سکی تو اگلا مرحلہ دنیا بھر سے متشدد اور خودکشی کیلیئے تیار خوارج کو استعمال کرنے کا تھا۔سوشل میڈیا اور عالمی نشریاتی اداروں کی مدد سے ایک افواہ چلائی گئی کہ درعا نامی قصبے میں سکول کے بچوں کو شامی فوج نے قتل کیا ہے۔اگرچہ اس دعوے کا کوئی ثبوت موجود نہیں تھا نہ ہی مقتول بچوں کے

والدین کا انٹرویو یا مقامی افراد کی کوئی گواہی سامنے لائی گئی۔ حتیٰ کہ عزمی بشارہ جیسے اسد مخالف لکھاری نے بھی اپنی کتاب "سوریہ: درب الامم نحو الحریہ" کے صفحہ 84 پر لکھا ہے: "درعا کے بارے میں پھیلی ہوئی روایات مبالغہ آمیزی اور پروپیگنڈا پر مبنی ہیں۔ بچوں پر تشدد اور ان کے قتل کا جھوٹ اس لیے پھیلایا گیا تاکہ لوگوں کو ابھارنے کیلئے تیونس کے محمد بوعزیزی یا مصر کے خالد سعید جیسی ایک مثال قائم کی جائے"۔ اگر ٹھنڈے دل سے سوچا جائے تو بھلا شامی فوج یہ حماقت کیوں کرے گی جبکہ بشار الاسد دس سال قبل ہی مشرق وسطیٰ کے ٹکڑے کرنے کے منصوبے کے بارے میں عرب دنیا کو ہوشیار کر چکا تھا اور شامی حکومت جانتی تھی کہ کرنل قذافی کا بے رحمانہ قتل اصل میں ان کیلئے پیغام تھا تاکہ انکو ڈرا کر میدان سے بھگایا جائے۔ نیز یہ کیسی حکومت ہے جو بچوں کو تو قتل کرتی ہے مگر بڑوں کو چھوڑ دیتی ہے جو اس کیلئے حقیقی خطرہ بن سکتے ہیں۔ اصل میں بچوں کے قتل کی افواہ کا مقصد بشار الاسد کو بے رحم قاتل کے طور پر پیش کرنا تھا تاکہ معصوم بچوں کو بچانے کے نام پر دنیا بھر میں مفت کے سپاہی کئے جائیں۔ یہ ایسا ہی جھوٹ تھا جیسا پاکستان میں لال مسجد میں معصوم بچیوں کے نام پر پھیلایا گیا ہے حالانکہ سپریم کورٹ میں افتخار چوہدری صاحب کے سامنے مولانا عبد العزیز صاحب ایک بھی بچی کا قتل ثابت نہیں کر سکے۔

بحران کے آغاز میں درعا میں جو کچھ ہوا وہ دشمن کے ہتھکنڈوں کی عکاسی کرتا ہے۔ ایک ہتھکنڈا بچوں کے قتل کی جعلی خبریں بنانا تھا جو کامیابی سے بعد میں بھی استعمال کیا جاتا رہا۔ دوسری چال شام میں مذہبی بنیادوں پر تشدد کو رواج دینا تھا۔ درعا میں 16 مارچ 2011 کو اخوان المسلمون کے مظاہرے میں جو نعرے لگے وہ یہ تھے "مسیحیو بیروت میں جاؤ، علویو تابوت میں جاؤ"۔ پیغام واضح تھا، شامی اقلیتوں کیلئے بقا کا سوال پیدا کر کے شام کے ٹکڑے کرنا۔ اخوان المسلمون کے جھانسے میں آنے والے نوجوان یہ نہ سمجھ سکے کہ جو غیر ملکی طاقتیں آج ان کی مدد سے اسد کو مارنا چاہتی ہیں اور ان کو ایسے نعرے لگانے پر اکسا رہی ہیں، وہ بعد میں اقلیتوں کو بچانے کیلئے شام کو تقسیم کریں گی۔ لیکن یہ مرحلہ آنے سے پہلے بشار الاسد کا ہٹنا ضروری تھا جو شام کے تحفظ کی قسم کھائے ہوئے تھا۔ درعا میں تیسرا کام یہ کیا گیا کہ عدلیہ کو آگ لگا دی گئی۔ عدلیہ کی عمارت کسی کی ذاتی جاگیر نہیں تھی، بلکہ وہ عوام کے ٹیکس سے بنی تھی۔ مگر یہ لوگ صرف سیاسی تبدیلی نہیں چاہتے تھے بلکہ ریاست کو کمزور کرنا چاہتے تھے۔ سرکاری عمارتوں پر حملوں کا سلسلہ بھی یہیں سے شروع ہوا۔

ادھر بعض سادہ لوح افراد کھیل سمجھ کر ان مظاہروں میں شریک ہونے لگے تھے۔ اخوان المسلمون کو سو سال میں پہلی مرتبہ شام میں کچھ حمایت ملی تھی، وہ آپے سے باہر ہو گئے۔ اخوان المسلمون کے مظاہرے پہلے سے زیادہ نفرت انگیز ہوتے جا رہے تھے۔ بشار علوی خاندان سے تعلق رکھنے والا شافعی سنی تھا اس لیے علویوں کو خصوصی دھمکیاں لگائی جاتی تھیں۔ عام نعت اور میلاد والے سنیوں کو، شیعوں کو، مسیحیوں کو بھی قتل عام کی دھمکیاں لگائی جاتی تھیں۔ صرف یہی نہیں، بلکہ بارڈر سے باہر موجود اختلاف نظر رکھنے والوں کو بھی دھمکیاں لگائی جانے لگیں۔ مارچ 2011 میں ہی لبنان

کی حزب اللہ اور ایران کو تنبیہ کی جانے لگی کہ شام کے بعد آپ کی باری ہے۔ گویا حزب اللہ کیلئے اسرائیل کے ساتھ ساتھ ایک دوسرا خطرہ پیدا ہو گیا تھا جو اس کو واجب القتل سمجھتا تھا۔ حزب اللہ کے پرچم جلائے جانے لگے، اخوان المسلمون اسرائیل اور امریکہ کی دوستی میں کسی کو خاطر میں نہیں لا رہے تھے۔ متعدد مظاہروں میں ایسی دھمکیاں ملنے کے بعد 25 مئی 2011 کو حزب اللہ کے جنرل سیکرٹری نے شام کی صورت حال پر خطاب کیا جس میں اصلاحات کے مطالبے کی حمایت کی اور کہا کہ مظاہرین کو بیداری سے کام لینا چاہئیے اور شام کے امن اور دفاع کو نقصان پہنچانے والی کسی حرکت سے گریز کرنا چاہئیے۔ نیز ان کو خیال رکھنا چاہئیے کہ ان کا ملک علاقے میں اسرائیلی منصوبوں کے سامنے مزاحمت کرنے والا ملک ہی رہے اور ایسا نہ ہو کہ باقی ممالک کی طرح یہ ملک بھی مغرب کی جھولی میں جا گرے۔ سید حسن نصر اللہ نے متحارب فریقوں کو اسلحے کے بجائے مذاکرات کی راہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ معروف امریکی جریدے وال سٹریٹ جرنل کو انٹرویو دیتے ہوئے المجلس الوطن السوری کے رہنما برہان غلیون نے کہا کہ اسد کو ہٹانے کے بعد ہم شام کا تعلق حزب اللہ، حماس اور ایران سے توڑ ڈالیں گے۔ ادھر بڑھتے ہوئے مظاہرے دیکھ کر شامی حکومت نے اپنے حامیوں کو مظاہرے کرنے کا کہہ دیا۔ تمام بڑے شہروں میں اسد کی حمایت میں ہزاروں لوگ نکلے اور آج بھی ان مظاہروں کی ویڈیوز یوٹیوب پر دیکھی جاسکتی ہیں۔ ان کا نعرہ تھا: "اللہ، سوریہ، بشار" اور "اللہ محیی الجیش"۔ لیکن شام، جو کبھی مشرق وسطیٰ میں امن کا گہوارہ تھا، اب پر امن نہیں رہا تھا۔ بشار الاسد کی حمایت کرنا جرم بن چکا تھا اور سزا تھی موت!

اگر ٹھوس شواہد کی روشنی میں دیکھا جائے تو شام میں نام نہاد عرب بہار کے آغاز کے بعد پہلا قتل 10 اپریل 2011 کو نضال جنود نامی شخص کا ہوا۔ یہ شخص ایک غریب سبزی فروش تھا۔ اس کا قصور یہ تھا کہ اس کا تعلق ایک مختلف مذہب سے تھا۔ اخوان المسلمون کے مظاہرین نے اس کو گھیرے میں لیا، ڈنڈوں اور پتھروں کی بارش کی اور قتل کرنے کے بعد سڑک پر گھسیٹا۔ اس ظلم کی ویڈیو سوشل میڈیا پر لگا دی گئی۔ یہ لوگ اس طرح شام میں موجود اخوان المسلمون سے اختلاف رکھنے والوں کو ڈرانا چاہتے تھے مگر نہیں جانتے تھے کہ یہی خوف شامی عوام کو بقا کی جنگ لڑنے پر مجبور کرے گا اور آگے چل کر ان کے اپنے گلے کا پھندا بن جائے گا۔ دہشتگردی کی دوسری کاروائی 12 اپریل 2011 کو ہوئی، قصبہ بانیاس میں شامی فوج کے ایک کاروان پر حملہ کر کے 9 فوجی جوان شہید کر دیئے گئے۔ فوج کی جاسوسی اور اس پر کمین لگا کر حملہ کرنا پر امن مظاہرین کا کام نہیں تھا۔ دشمن کی انٹیلی جنس سپورٹ اور اسلحے کے بغیر یہ ممکن نہیں تھا۔ ان کاروائیوں کے جواب میں حکومت نے شہروں میں فوج طلب کر لی۔ حمص میں فوج کا استقبال سنائپرز نے کیا۔ پیغام واضح تھا، شام میں ایسے تربیت یافتہ دہشتگرد آ چکے تھے جو نہ صرف کلاشنکوف بلکہ سنائپر گن جیسے اسلحے کو چلانا جانتے تھے۔ شام

کی گلیاں ان جتھوں کے ہاتھوں یرغمال اور سنسان ہوتی جارہی تھیں۔ 6 جون 2011 کو جسر الشغور نامی قصبے میں ایک سو کے قریب شامی فوج کے جوانوں کو قتل کیا جن میں اکثریت اہل سنت کی تھی۔

شام میں بدامنی عروج پر تھی مگر امریکہ اور برطانیہ کے سفیروں نے بخیر وعافیت حماہ شہر کا دورہ کیا جہاں اخوان المسلمون کے کارکنان نے ان کا شاندار استقبال کیا۔ یہ اس حقیقت کا اظہار تھا کہ افغان جنگ کے بعد ایک مرتبہ پھر امریکا نے ان لوگوں کو خرید لیا تھا۔ اس دورے کے کچھ دن بعد جولائی 2011 میں کچھ فوجی افسر خرید کر جیش الحر نامی لشکر ترتیب دیا گیا۔ اگست 2011 میں حلب کے قصبے الباب کے ڈاکخانے پر حملہ کر کے اس کے ملازمین کو عمارت کی چھت سے نیچے پھینک کر قتل کیا گیا اور حماہ شہر میں شامی فوج کے افسران کو قتل کر کے دریائے عاصی میں پھینک دیا گیا۔ پورا ملک آگ میں جل رہا تھا اور باغی اپنے مظالم کی ویڈیو بنا کر سوشل میڈیا پر پوسٹ کرتے جس کے عوض بیرونی امداد میں اضافہ ہوتا اور شامی عوام خوفزدہ ہوتے۔ مختلف علاقوں میں مختلف لشکر سامنے آنا شروع ہو گئے۔ قتل اور تشدد کے طریقے بھیانک سے بھیانک تر ہوتے گئے۔ گویا باغیوں کے ذہن وقت کے ساتھ ساتھ جہنم کی گہرائیوں میں جارہے ہوں۔ لواء خالد ابن ولید نامی گروہ کی طرف سے ایک دل دہلا دینے والی ویڈیو سامنے آئی جس میں ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا ایک مغوی کا گلا ٹوکے سے کاٹ رہا تھا۔ ایک اور ویڈیو میں جیش الحر سے تعلق رکھنے والے باغی ابو صقار نے ایک شامی فوجی کا سینہ چاک کیا اور اس کے جگر کو چبایا۔ یہ متشدد اور اذیت ناک طریقے سے قتل کرنے کا عمل اسلام کی تعلیمات کی صریح خلاف ورزی تھی۔ ان گروہوں کے نام اور مقام مختلف تھے مگر یہ لوگ ایک قسم کے تھے: خوارج!

مغربی اور اسرائیلی ذرائع ابلاغ کہہ رہے تھے کہ شامی باغی معتدل اور جمہوریت پسند ہیں۔ سوشل میڈیا پر شامی باغیوں کے پیغامات میں کچھ اور ہی بات ہو رہی تھی۔ اگر آپ کو یاد ہو تو اسی زمانے میں پاکستان میں بے شمار فیس بک پیجز بنا کر یہاں بھی بریلویوں اور شیعوں کو اسی قسم کے سلوک کے دہرائے جانے کی دھمکیاں لگائی جاتی تھیں اور شامی خوارج کی دہشتگردی کی وارداتوں کو کفر پر غلبے کے نام سے پیش کیا جاتا تھا۔ ہر کوئی کہہ رہا تھا کہ اسد کے دن گنے جا چکے ہیں۔

سال 2011 کے اختتام پر شامی باغی ٹینکوں اور توپوں سے مسلح ہو چکے تھے۔ جدید اسلحہ اور اس کو چلانے والے دہشتگردوں کو اردن اور ترکی کے راستے شام میں داخل کیا جارہا تھا۔ فروری 2012 میں القاعدہ کے رہنما ایمن الزواہری نے اپنے ویڈیو بیان میں کھلم کھلا اپنے پیروکاروں کو شام میں جہاد کرنے کی دعوت دے ڈالی۔ جبہہ النصرہ نام کا ایک اور دہشتگرد گروہ سامنے آگیا۔ پوری دنیا سے خوارج کی آمد میں ڈرامائی طور پر اضافہ ہو گیا۔ منظر نامہ واضح تھا: بشار الاسد کی موت اور اس کے بعد شام میں افغان مجاہدین کی طرح خانہ جنگی۔ لبنان کے ساحلی شہر طرابلس میں اسلحے سے بھرا بحری جہاز پکڑا گیا جو وہاں موجود سلفی گروہوں کو شام کیلئے مسلح کر رہا تھا۔ سن 2012 کے وسط میں دمشق کا محاصرہ

کیا جا چکا تھا، ادھر لبنان کے جنوب کے ساتھ لگنے والے شامی علاقوں میں باغیوں کے لشکر جمع ہو رہے تھے۔اپریل 2012 میں معروف باغی مولوی احمد العرعور کی جانب سے فتویٰ سامنے آیا کہ دمشق کے نواحی علاقے میں موجود رسول اللہؐ کی نواسی سیدہ زینب بنت علی (س) کے روضے سمیت باقی مزارات کو گرا دیا جانا چاہیئے۔18 جولائی 2012 کو شامی وزارت دفاع کی عمارت کو سرنگ کھود کر دھماکے کا نشانہ بنایا گیا۔اس وقت عمارت میں اہم اجلاس جاری تھا۔جنرل حسن ترکمانی، جنرل ہشام بختیار، وزیر دفاع داود رجھا، اور شامی انٹیلی جنس کے چیف جنرل آصف شوکت شہید کر دیئے گئے۔یہ شام کو آج تک پہنچنے والا سب سے بڑا دھچکا تھا۔سید حسن نصر اللہ نے اس شام خطاب کیا اور شہدا کو خراج عقیدت پیش کیا اور کھلے الفاظ میں کہا کہ شہادت کی حد تک مخلص ان قائدین کی وجہ سے ہی لبنان اور فلسطین کی مزاحمتی تحریکیں زندہ رہی ہیں۔شام کے قصبے القصیر سے حزب اللہ پر حملے شروع کر دیئے گئے۔ادھر دمشق کا گھیراؤ ہو چکا تھا اور نواحی علاقوں میں فیصلہ کن جنگ جاری تھی۔

بشار الاسد کی بیوی اسماء الاسد کو برطانیہ سے پیغام موصول ہوا جس کے مطابق وہ اپنے بچوں کی جان بچانے کیلئے برطانیہ جا سکتی تھی۔بشار الاسد سے ترکی کے ذریعے کہا گیا کہ وہ بیس دن میں پانچ سو آدمی اپنے ساتھ لے کر جانا چاہے تو اسکو یہ مہلت دی جائے گی۔لیکن بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں جہاں انسان اپنی جان کی پرواہ کرے تو یہ خیانت شمار ہوتی ہے۔بشار اور اس کے گھر والوں نے دمشق میں ہی جینے اور وہیں مرنے کا فیصلہ کیا۔آگے چل کر اس فیصلے کے دور رس نتائج سامنے آئے۔دار الحکومت میں روز اپنے دفتر جاتا ہوا بشار الاسد شامی قوم کیلئے متحد اور بے خوف ہو کر لڑنے کیلئے مرکز امید بن گیا۔دور دراز علاقوں میں جا کر وطن کا دفاع کرنے والوں کو یقین تھا کہ اسد ان کو تنہا نہیں چھوڑے گا۔دمشق جنگ عظیم دوم میں کامیاب مزاحمت کرنے والے روسی شہر سینٹ پیٹرز برگ (لینن گراڈ) جیسی ایک اور مثال بن گیا۔

شام میں سیدہ زینب (س) کے روضے پر راکٹ حملے کی خبر نے دنیا بھر کے شیعہ سنی مسلمانوں کے دل ہلا دیئے۔اس سے پہلے صحابی رسولؐ حضرت عمار یاسرؓ کے مزار کو بم سے اڑایا جا چکا تھا۔اب عراق اور لبنان کے شیعہ روضے کی حفاظت کیلئے شام آنے لگے۔تقریباً ایک ماہ بعد شام میں حزب اللہ کے پہلے جوان موسیٰ علی کی شہادت کی خبر آئی جو ذاتی طور پر دمشق آیا تھا۔

دسمبر 2012 میں شامی باغیوں کی طرف سے اسرائیل کی حمایت میں کھلے عام بیان آنے لگے۔جیش الحر کے ابو فادی کے مطابق وہ بشار سے لڑنے کیلئے عام اسرائیلی کیا، شعرون جیسے مجرم سے بھی اتحاد کر سکتے ہیں۔سی این این کو انٹرویو دیتے ہوئے دانی عبد الدایم نے کہا کہ جو بھی ہماری مدد کرے ہمیں قبول ہے، حتیٰ اسرائیل۔جنوری 2013 میں عبد

الحلیم خدام نے پیرس میں انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ شام کی حکومت جلد ختم ہونے والی ہے،اس کے بعد ہم حزب اللہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے۔ بالآخر اپریل 2013 میں حزب اللہ نے شام کی جنگ میں باقاعدہ شمولیت کا اعلان کر دیا۔

سن 2014 میں حلب اور رقہ میں باغیوں کے درمیان خلافت پر جھگڑا ہوا اور داعش الگ ہو گئی۔ داعش کا ماننا تھا کہ جو کام باغی شام میں کر رہے ہیں وہ دنیا کے باقی حصوں میں بھی ہونا چاہیئے۔ بربریت اور وحشت کے حساب سے دونوں میں کوئی فرق نہیں تھا،البتہ داعش نے یورپ پر بھی حملے کر دیئے جسکی وجہ سے اسے برا کہا جانے لگا۔ سن 2015 میں شام کے دوسرے اہم اتحادی روس نے بھی شام کی جنگ میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ وہ باغیوں کے چیچنیا میں نفوذ پیدا کرنے سے خوفزدہ ہو گیا تھا۔

گزشتہ پانچ سال میں حزب اللہ کے اٹھارہ سو لوگ شام میں قتل ہو چکے ہیں جو بہر حال شام پر باغیوں کے قبضے کے بعد القاعدہ اور اسرائیل کے مشترکہ حملے کی صورت میں ہونے والے ممکنہ نسلی صفائے سے کہیں کم تعداد ہے۔ روس کی مدد فضائی بمباری تک ہے۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ القاعدہ کے خلاف جنگ میں سب سے بڑا حصہ شام کی اپنی فوج کا ہے جو دو لاکھ جوانوں اور افسروں کی قربانی دے چکی ہے اور باقی اتحادیوں کا کردار محدود ہے۔

کیا جو کچھ شام میں ہوا یہ ایک انقلاب ہے ؟ سماجی علوم کی روشنی میں کسی انقلاب کیلیئے تین عناصر بہت اہم ہیں :

1. عوام کی واضح اکثریت کی حمایت

2. عوام کا ایک قائد پر اعتماد اور ان کے آپس کا اتحاد

3. انقلاب کے بعد نظام مملکت چلانے کیلیئے ایک واضح منصوبہ

شام کے بحران میں باغیوں کے مظاہروں میں عوام کی شرکت کم رہی ہے۔ باغیوں میں اب تک دو سو گروہ بن چکے ہیں۔ انقلاب کے بعد اخوان المسلمون اور القاعدہ کے پاس مملکت کو جدید دور کے تہہ در تہہ تقاضوں کے مطابق چلانے کی صلاحیت نہیں ہے۔ یہ بات مصر میں مرسی حکومت کے دوران ثابت ہو چکی۔ اصل میں عرب بہار کے نام سے جو تحریک چلی اس میں انقلاب نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

باب ہفتم: شام کی جنگ میں کون کیا ہے؟

شام میں القاعدہ جیسی تنظیموں کی طرف سے جہاد کے نام پر لوٹ مار، قتل و غارت، انسانی اعضا اور خواتین کی سمگلنگ جاری ہے۔ساری دنیا سے شام جانے والے خوارج جس علاقے پر قبضہ کرتے ہیں وہاں میلاد پر پابندی لگ جاتی ہے۔میلاد منانے والے سنیوں کے گلے کاٹے جاتے ہیں،ان کے بچوں اور عورتوں کو ڈھال بنالیا جاتا ہے۔شیعہ شہریوں سے تو اور بھی برا سلوک ہوتا ہے۔یہی حال مسیحی اور دوروز آبادیوں کا ہے۔شام میں جاری بحران میں ایک طرف تو باغیوں کی حمایت اسرائیل اور اسرائیل کو ریاست تسلیم کرنے والے اور سفارتی تعلقات قائم رکھنے والے ممالک کر رہے ہیں اور دوسری طرف شامی عوام حکومت کے خلاف سول نافرمانی نہیں کر رہے اور اتنے سخت حالات میں بھی ملک کا انتظام چلارہے ہیں۔شام میں فوج، سول سروسز، ہسپتال، اسکول، بنک، پولیس، ٹریفک، کاروبار، ٹیکس کا نظام، غرض ریاست کے تمام کام معمول کے مطابق چل رہے ہیں۔شام میں بغاوت کے سب سے بڑے حامی وہ حضرات ہیں جنہوں نے ساری دنیا میں امریکی مفاد کیلئے جہاد کیا مگر آج تک اسرائیلی غاصب ریاست پر کوئی حملہ نہیں کیا۔الٹا جنگ میں زخمی ہونے والے شامی باغیوں کیلئے اسرائیل نے شامی سرحد پر ہسپتال قائم کر رکھے ہیں اور لڑائی کے دوران باغیوں کو اسرائیلی فضائیہ اور جاسوسی اداروں کی مدد حاصل رہی ہے۔

ان دہشتگردوں نے نجانے کتنے شامی سنیوں کو مشرک کا فتویٰ لگا کر قتل اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنا رکھا ہے۔شامی عورتوں کو عرب ممالک میں بھیڑ بکریوں کی طرح بیچا جا رہا ہے۔سوال یہ ہے کہ کیا اردن، ترکی، سعودی عرب، قطر، مصر، لیبیا، تیونس، افغانستان، تاجکستان، ملائشیا وغیرہ سے آنے والے ان جہادیوں نے اپنے ممالک میں کوئی فلاحی ریاست قائم کرلی ہے؟لیبیا کو تو ان لوگوں نے تباہ و برباد کر دیا اور اب اس کا کوئی پرسان حال نہیں۔لیبیا کے تین ٹکڑے ہو چکے ہیں اور وہاں انسان غلام بنا کر بیچے جا رہے ہیں۔بہت سے علاقوں میں زندگی کی بنیادی ضروریات بھی میسر نہیں اور جنگل کی طرح کا ماحول ہے۔

شام کی جنگ میں بہت سے فریق ہیں۔امریکا وہاں جماعت اسلامی قسم کے لوگوں کو لانا چاہتا ہے جنھیں بعد میں مرسی کی طرح ہٹا کر کوئی اسرائیل نواز ڈکٹیٹر لایا جائے۔کیونکہ شام کا اسد واحد پڑوسی حکمران ہے جس نے اسرائیل کو تسلیم نہیں کیا ہے۔جی ہاں،اردگان کے ترکی، مصر اور اردن کے اسرائیل سے باقاعدہ سفارتی اور تجارتی تعلقات ہیں۔یہاں تک کہ جب مصر میں اخوان المسلمون کی حکومت آئی تو عوام نے اسرائیلی سفارتخانہ بند کر دیا لیکن اخوان المسلمون نے عوام کی خواہشات کا خیال نہ کرتے ہوئے اسرائیلی سفارت خانے کو دوبارہ کھول دیا۔روس کا مفاد یہ ہے کہ روس شام کی سرحد سے پانچ سو کلو میٹر دور ہے،اگر شام میں جماعت اسلامی قسم کے لوگ آتے ہیں تو روس میں دھماکے شروع ہوں گے

کیونکہ وہاں چیچنیا میں خلافت کا نعرہ لگتا رہا ہے۔ایران شام میں بشار کا حمایتی ہے، کیوں کہ شام کے سوا اس علاقے میں ایران کا کوئی قابل بھروسہ دوست نہیں ہے اور شام میں جنرل سیسی جیسا حکمران آیا تو ایران فلسطین کے مسئلے سے کٹ جائے گا۔ایسی صورت حال میں اسرائیل لبنان پر دوبارہ قبضہ کرلے گا۔ سعودی عرب اور خلیجی ریاستیں شام کے معاملے میں امریکا کو خوش رکھنا چاہتی ہیں تاکہ انکی اپنی خاندانی بادشاہت کو کوئی خطرہ نہ ہو۔اسرائیل ہمیشہ کی طرح یہاں بھی امریکا کا پٹھو ہے، اسکی بقاہی امریکا کا طفیلیہ بننے میں ہے۔ترکی شام میں امریکا سے مل کر جماعت اسلامی کی مرسی قسم کی حکومت بنانے کے بعد امریکا کا ساتھ چھوڑنے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ لیکن یہ شیخ چلی والی حماقت ہے جو مصر میں ناکام ہو چکی ہے۔امریکا کا ایک اور مقصد غیر سنی علاقوں کو الگ ملک بنانا ہے۔اگر امریکا کے منصوبے کے مطابق شام میں بشار الاسد قتل ہوتا ہے اور شام کی تسبیح ٹوٹتی ہے تو وہ پینترا بدل کر شامی اقلیتوں کا حامی بن جائے گا۔اس سے شام کے چار ٹکڑے ہوں گے اور وہ اسرائیل کے خلاف کچھ کرنے کے قابل نہیں رہے گا بلکہ چاروں ٹکڑے پانی، تیل اور زراعت کیلئے آپس میں لڑتے رہیں گے۔ یہاں ترکی کردستان بننے کے خلاف ہے کیونکہ ایسی صورت میں اسکو کرد اکثریتی صوبے سرناک سے ہاتھ دھونے پڑ سکتے ہیں۔ لہٰذا ترکی کرد سنیوں پر حملہ کر رہا ہے تاکہ کردستان کا منصوبہ ناکام ہو۔

شام میں بھی افغان مجاہدین کی طرح ایک خود ساختہ خلیفہ بھی دوسرے کو تسلیم نہیں کرتا۔مثال کے طور پر دمشق کے نواحی علاقے غوطہ میں فلیق الرحمن، جیش الاسلام، احرار الشام اور ھیات تحریر الشام نامی گروہوں کے آپس میں کئی خونی جنگیں ہو چکی ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان لڑائیوں کے دوران باغی گروہوں نے ایک دوسرے پر کفر اور ارتداد کے فتوے لگائے ہیں۔دراصل یہ سید قطب اور مولانا مودودی کے فکری انحراف کا نتیجہ ہے جو اپنے پیش کردہ اسلامی ریاست کے تصور کے مخالفین کو اسلام کا منکر قرار دیتے ہیں۔رقہ اور حلب میں جب باغیوں کا قبضہ تھا تو وہاں بھی اقتدار کیلئے یہ لوگ آپس میں لڑے جسکی وجہ سے داعش کا ظہور ہوا۔ادلب میں بھی ایک باغی خلیفہ کے مریدین دوسرے خود ساختہ خلیفہ کے مریدوں کے خون کے پیاسے ہیں۔ شامی عوام کے پاس ان بھانت بھانت کے جعلی خلیفوں سے نجات کا ایک راستہ ہے اور وہ یہ کہ وہ شامی فوج کو مضبوط کریں۔ شامی عوام پر امریکی پروپگنڈے کی اصلیت کھل چکی ہے اور شامی فوج روز نئی فتوحات حاصل کر رہی ہے۔جب شام متحد ہو جائے گا تو جس کو اختلاف ہو وہ پرامن احتجاج کی مدد سے لوگوں کو ساتھ ملا کر جس قسم کی حکومت بنانا چاہے بنا لے۔اسلحے کے زور پر مستحکم حکومت نہیں، ڈاکو راج قائم ہوتا ہے۔

البتہ چونکہ شام ستر سال سے امریکا اور اسرائیل کے مقابلے میں مسلح جنگ کے علاوہ سفارت کاری کی جنگ کرتا رہا ہے۔حافظ الاسد ہمارے ذوالفقار علی بھٹو کی طرح ایک فطین شخص تھا۔اس لیے شام کے پاس اعلی تعلیم یافتہ سٹریٹیجک اور سیاسی منصوبہ ساز موجود ہیں۔بشار ایک فرد کا نام نہیں بلکہ ایک ٹیم کا نام ہے جسکی تربیت حافظ الاسد نے کی تھی۔ان

میں اکثر سنی ہیں۔ لہٰذا ابھی تک شامی حکومت نے نہایت کامیابی سے میدان جنگ اور مذاکرات کی میز پر لوہا منوایا ہے۔ شامی حکومت لیبیا کی طرح کھوکھلی ثابت نہیں ہوئی بلکہ لوہے کا چنا بن چکی ہے۔

اللہ بشار الاسد کے ساتھ ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: جو لوگ ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں، ہم ان کو راستہ دکھاتے ہیں (سورہ عنکبوت، آیت 69)۔ اللہ نے اپنے وعدے کے مطابق بشار الاسد کو جنگ اور مذاکرات میں صحیح راستے دکھائے ہیں۔ شامی عوام کی خواہش ہے کہ بشار الاسد اس بحران سے غازی بن کر نکلے۔ شام میں ظلم کا بازار گرم ہے۔ شام میں خوارج نے اتنے ظلم کئے ہیں کہ خدا کا غضب جوش میں آگیا۔ خون کے دریا بہانہ ظلم ہے۔ جھوٹ بولنا ظلم ہے۔ غزہ، یمن اور موصل کے بچوں کی تصویریں شام کے نام سے لگانا ظلم ہے۔ جھوٹی ویڈیو بنانا ظلم ہے۔ علویوں اور مسیحیوں کے بچوں کو زہر کھلا کر انکی ویڈیو کیمیائی حملے کے نام سے چلانا ظلم ہے۔ اللہ مظلوموں کے ساتھ ہے۔ جتنا اسلحہ باغیوں کو ملا اور جتنے لوگ دنیا بھر سے شام گئے اس کے باوجود بشار اور شام کا بچ جانا صرف اللہ کی مرضی سے ہوا ہے۔

شام کے بحران کے تناظر میں دو سوال بہت اہم ہیں: اگر شامی عوام کی اکثریت بشار الاسد کی مخالف ہے تو مصر کی طرح یہاں تمام بڑے شہروں کو بند کر کے حکومت کو مفلوج کیوں نہیں کرتے؟ کیا وجہ ہے کہ شام میں اخوان المسلمون کے احتجاج میں چند سو افراد سے زیادہ لوگ شریک نہیں ہوتے؟ دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ باغی شہر سے باہر نکل کر جنگ کیوں نہیں کرتے؟ شام کے جنگلوں میں جنگ کیوں نہیں کرتے؟ عوام کو یرغمال بنانے کی ضرورت کیا ہے؟ سنت رسولؐ تو میدان میں نکلنا ہے، آپؐ نے کوئی جنگ مدینے کی گلیوں میں نہیں لڑی۔ کربلا والے بھی میدان میں نکلے تھے۔ دنیا میں جتنے بھی انقلاب آئے ہیں وہ یا پر امن دھرنے سے حکومت کو مفلوج کر کے یا پھر میدانوں اور جنگلوں میں جنگ کر کے آئے ہیں۔ جنگیں میدانوں میں لڑی جاتی ہیں، گلی محلوں میں صرف ڈاکو مقابلے کرتے ہیں۔ اگر شامی باغی سچے ہیں اور عوام کے حمایت یافتہ ہیں تو میدان میں کیوں نہیں نکلتے؟ اگر میدان میں نہیں لڑ سکتے تو قصبوں کے عوام کو ڈھال نہ بنائیں اور انکو حکومت کے بنائے گئی پناہ گاہوں میں جانے دیں۔ اگر موت سے اتنا ہی ڈر لگتا ہے تو ہتھیار پھینک کر پر امن جدوجہد شروع کریں۔ آج تک شام میں دو لاکھ فوجی شہید ہو چکے ہیں۔ پولیس، محکمہ تعلیم، محکمہ صحت، سول سروس، عدالتیں، یہ سب شامی عوام ہی چلا رہے ہیں۔ ان حالات میں ایک ملک گیر ہڑتال اسد کی حکومت کے خاتمے کیلئے کافی ہے۔ شام کی جنگ میں عوام اسد کے ساتھ ہیں اور وہ طالبانی انقلاب کو مسترد کر چکے ہیں۔ وہ اپنے ملک کو نہ لیبیا بنانا چاہتے ہیں نہ اس کے چار ٹکڑے ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں۔

غزہ اور یمن کی تصویریں شام کے نام سے استعمال کر کے کہا جارہا ہے کہ شامی فوج ظلم کرتی ہے۔ ظلم ہمیشہ غیر ملکی افواج کر سکتی ہیں۔ کوئی فوج اپنے ملک کی اکثریت پر ظلم کر کے باقی نہیں رہ سکتی۔ اگر شام کی فوج ظالم ہوتی تو شامی لوگ اس کی ملازمت چھوڑ دیتے۔ شام میں خوارج نے امریکہ سے اسلحہ لے کر کئی قصبوں کو یرغمال بنایا ہے۔ اگر شامی عوام کی اکثریت بشارالاسد کے خلاف ہوتی تو باغیوں کو امریکا سے اسلحہ لینے کی ضرورت نہ ہوتی اور پرامن دھرنے اور ہڑتال کر کے اس کی حکومت کو ختم کر دیتے۔

شام اور عراق میں اسلام کے نام پر کئے جانے والے مظالم کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ دنیا بھر میں اسلام کی بدنامی ہوئی ہے۔ اسلام کے خلاف تعصب رکھنے والے لوگوں نے مسلمانوں کو چنگیز خان اور ہٹلر سے تشبیہ دینا شروع کر دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی خلافت کے نام پر بننے والی مسلح تنظیمیں عمل میں چنگیز خان اور ہٹلر کی پیروکار ہیں۔ وہ جہاں بھی گئے سوائے مار دھاڑ کے کچھ نہ کیا۔ جبکہ اس کے برعکس اسلام نے جنگی غلبے کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ تہذیب کی بنیاد رکھی تھی۔ نائجیریا کی تکفیری دہشتگرد تنظیم نے تو اپنا نام ہی بوکو حرام رکھا ہے جس کا مطلب ہے کہ مغربی تعلیم حرام ہے۔ جبکہ ماضی میں مسلمانوں نے علم کو اسلامی اور غیر اسلامی میں تقسیم کرنے کے بجائے مشرق و مغرب کی کتابوں کو پڑھا اور ان علوم کو نئی بلندیوں تک پہنچایا ہے۔ شامی مجاہدین کی حرکتوں کو سب مسلمانوں پر تھونپا جارہا ہو تو حضرت عمرؓ کے شام، عراق اور ایران میں اختیار کئے گئے طرز عمل کو پیش کیا جانا ضروری ہے۔ اس چیز میں شیعہ و سنی کا کوئی اختلاف نہیں کہ فلسطین کے دورے کے موقعے پر انہوں نے سب مسلمانوں کی نمائندگی کا حق ادا کر دیا تھا۔ آج مذہبی بنیادوں پر قتل عام کرنے والے نام نہاد مجاہدین کی اصلیت کھولنے کے لئے اس زمانے کی مثال سامنے لانا ضروری ہے جب اس قسم کا قتل عام کرنے کی صلاحیت بھی موجود تھی اور باقی دنیا میں اسکی مثالیں بھی موجود تھیں۔ انہوں نے آرمینائی اور آشوری مسیحیوں، یہودیوں اور دیگر مذہبی اقلیتوں کو نہ تو قتل کیا نہ ہجرت پر مجبور کیا۔

خارجی دہشتگرد تنظیموں نے تاریخی آثار پر حملہ کر کے شام اور عراق کے باشندوں کو انکے تاریخی اور تہذیبی پس منظر سے کاٹنے کی کوشش بھی کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شرک کا ٹھپہ لگا کر اثار قدیمہ کو مسمار کرنے کا مقصد مشرق وسطیٰ کی تاریخی بنیادوں کو ہلانا ہے۔ اگر شام اور عراق کے اثار قدیمہ سے اسلام کو کوئی خطرہ ہوتا تو جن لوگوں نے ان علاقوں تک اسلام کا پیغام پہنچایا تھا وہ ایک جہادی مہم چلا کر تاریخی آثار کو مٹا دیتے۔ وہ ان مغربی فیکٹریوں کے تیار کردہ مجاہدین سے کہیں بہتر اسلام کو سمجھتے تھے۔ اگر آج شام اور عراق کا رشتہ اپنی تاریخ سے کٹ جائے تو اگلے کچھ عشروں کے بعد اپنی مرضی کی تاریخ گھڑنے والے آجائیں گے جو یہ دعوا کر سکتے ہیں کہ اس علاقے میں کبھی کوئی تہذیب نہیں رہی اور یہاں رہنے والے سب لوگ مہاجر ہیں۔ اس طرح اسرائیل اس علاقے میں اپنی غیر قانونی موجودگی کو تاریخی بنیادیں فراہم کر سکے گا، جو یہاں موجود قدیم یہودی ورثے کی حفاظت کر رہا ہے۔

یہ لوگ حقیقت میں خوارج ہیں۔ نہج البلاغہ کے خطبہ نمبر 17 کے مطابق حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایسے لوگوں کی نفسیات کچھ یوں بیان فرمائی ہے:۔

"(یہ) شخص وہ ہے جس نے جہالت کی باتوں کو (ادھر ادھر سے) بٹور لیا ہے۔ وہ امت کے جاہل افراد میں دوڑ دھوپ کرتا ہے۔ فتنوں کی تاریکیوں میں غافل و مدہوش پڑا رہتا ہے اور امن و آشتی کے فائدوں سے آنکھ بند کر لیتا ہے۔ چند انسانی شکل و صورت سے ملتے جلتے ہوئے لوگوں نے اسے عالم کا لقب دے رکھا ہے، حالانکہ وہ عالم نہیں۔ وہ ایسی (بے سود) باتوں کے سمیٹنے کے لئے منہ اندھیرے نکل پڑتا ہے جن کا نہ ہونا ہونے سے بہتر ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ اس گندے پانی سے سیراب ہو لیتا ہے اور لایعنی باتوں کو جمع کر لیتا ہے تو لوگوں میں قاضی بن کر بیٹھ جاتا ہے اور دوسروں پر مشتبہ رہنے والے مسائل کے حل کرنے کا ذمہ لے لیتا ہے۔ اگر کوئی الجھا مسئلہ اس کے سامنے پیش ہوتا ہے تو اپنی قیاس آرائی کر کے اس کے لئے بھرتی کی فرسودہ دلیلیں مہیا کر لیتا ہے اور پھر ان پر یقین بھی کر لیتا ہے۔ اس طرح وہ شبہات کے الجھاؤ میں پھنسا ہوا ہے جس طرح مکڑی خود ہی اپنے جالے کے اندر۔ وہ خود یہ نہیں جانتا کہ اس نے صحیح حکم دیا ہے یا غلط۔ اگر صحیح بات بھی کہی ہو، تو اسے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں غلط نہ ہو۔ اور غلط موقف اپنایا ہو تو اسے یہ توقع رہتی ہے کہ شاید یہی صحیح ہو۔ وہ جہالتوں میں بھٹکنے والا جاہل اور اپنی نظر کے دھندلے پن کے ساتھ تاریکیوں میں بھٹکنے والی سواریوں پر سوار ہے۔ نہ اس نے حقیقت علم کو پرکھا، نہ اس کی تہہ تک پہنچا۔ وہ روایات کو اس طرح درہم و برہم کرتا ہے جس طرح ہوا سوکھے ہوئے تنکوں کو۔ خدا کی قسم! وہ ان مسائل کے حل کرنے کا اہل نہیں جو اسے سے پوچھے جاتے ہیں۔ اور نہ اس منصب کے قابل ہے جو اسے سپرد کیا گیا ہے۔ جس چیز کو وہ نہیں جانتا اس چیز کو وہ کوئی قابل اعتنا علم ہی قرار نہیں دیتا۔ یہ سمجھتا ہی نہیں کہ جہاں تک وہ پہنچ سکتا ہے اس کے آگے کوئی دوسرا پہنچ سکتا ہے۔ جو بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی اسے پی جاتا ہے، کیونکہ وہ اپنی جہالت کو خود جانتا ہے"۔

اگر آپ غور کریں تو آپ کو میڈیا میں احادیث اور روایات سے کھیلتے اور یا مقبول جان کی طرح کے کئی لوگ مل جائیں گے جو ان علامات پر پورے اترتے ہیں۔

باب ہشتم: فتنہ خوارج (قرآن و حدیث کی روشنی میں)

قرآن حکیم کا بغور جائزہ لیا جائے تو کئی مقامات پر خوارج کی علامات و بدعات، فتنہ پرور روش، سازشی کاروائیوں اور مسلح بغاوت کے بارے میں واضح ارشادات ملتے ہیں۔ چنانچہ سورہ آل عمران کی آیت نمبر 7 میں ارشاد ہوتا ہے:۔

ترجمہ: "اللہ وہی ہے جس نے تجھ پر کتاب اتاری اُس میں بعض آیتیں محکم ہیں (جن کے معنٰی واضح ہیں) وہ کتاب کی اصل ہیں اور بعض آیتیں متشابہ ہیں (جن میں جنت، جہنم اور مستقبل کے معاملات کے بیان کیلئے تشبیہات کا استعمال ہوا ہے)۔ سو جن لوگوں کی نیت ٹیڑھی ہو وہ فتنہ پھیلانے اور خود ساختہ مطلب نکالنے کی غرض سے متشابہات کے پیچھے لگتے ہیں۔ حالانکہ اللہ کے علاوہ اور کوئی ان متشابہ آیات کے مفہوم سے پوری طرح واقف نہیں اور وہ جو علم میں راسخ ہیں وہ کہتے ہیں ہمارا ان سب چیزوں پر ایمان ہے جو ہمارے رب کی طرف سے ہیں، اور یہ بات سوائے صاحبانِ عقل کے کوئی نہیں سمجھ سکتا ہے"۔

حضرت ابوامامہؓ راوی ہیں کہ آیت مذکورہ (فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ) کی تفسیر میں رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ''ان ٹیڑھی نیتوں والوں سے مراد خوارج ہے"۔ (حوالہ: امام ابن ابی حاتم رازی۔ تفسیر القرآن العظیم ۲۔۵۹۴)

حافظ ابن کثیر نے بھی اس آیت کی تفسیر میں جو حدیث بیان کی۔ اس میں فرمان رسول ﷺ کے مطابق اہل زیغ سے مراد ''خوارج'' ہیں۔ (حوالہ: ابن کثیر۔ تفسیر القرآن العظیم۔ ۱:۳۴۷)

امام خازن نے اس آیت کی تفسیر میں ابوامامہؓ سے دیگر احادیث بھی نقل کرتے ہیں، اور امام حسن بصریؒ اور حضرت قتادہؒ سے بھی اہل زیغ سے مراد فرمان رسول ﷺ کے مطابق ''خوارج'' ہی بیان کرتے ہیں۔ (حوالہ: خازن: لباب التاویل۔ ۱:۲۱۷)

امام سیوطیؒ نے بھی اہل زیغ سے مراد ''خوارج'' لیے ہیں۔ (حوالہ: سیوطی۔ الدر المنثور، ۲:۱۴۸)

فتنہ خوارج کا آغاز عہد رسالت مآب ﷺ میں گستاخی رسول ﷺ سے ہوا۔ بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں ذوالخویصرہ تمیمی نامی شخص کی گستاخی دراصل اس بدترین فتنے کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: کہ ایک روز حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مالِ (غنیمت) تقسیم فرمارہے تھے تو ذوالخویصرہ نامی شخص جو کہ بنی تمیم سے تھا، نے کہا: یارسول اللہ! انصاف کیجئے۔ آپ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تو ہلاک ہو، اگر میں انصاف نہ کروں تو اور کون انصاف کرے گا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: مجھے اجازت دیں کہ اس کی گردن اڑا دوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نہیں، کیونکہ اس کے ساتھی بھی ہیں کہ تم ان کی نمازوں کے مقابلے میں اپنی نمازوں کو حقیر جانو گے اور ان کے روزوں کے مقابلہ میں اپنے روزوں کو حقیر جانو گے۔ وہ دین سے اس طرح نکلے ہوئے ہوں گے جیسے شکار سے تیر نکل جاتا ہے، پھر اس کے پیکان پر کچھ نظر نہیں آتا، اس کے پٹھے پر بھی کچھ نظر نہیں آتا، اس کی لکڑی پر بھی کچھ نظر نہیں آتا اور نہ اس کے پروں پر کچھ نظر آتا ہے، وہ گوبر اور خون کو بھی چھوڑ کر نکل جاتا ہے۔ وہ لوگوں میں فرقہ بندی کے وقت (اسے ہوا دینے کے لئے) نکلیں گے۔ ان کی نشانی یہ ہے کہ ان میں ایک آدمی کا ہاتھ عورت کے پستان یا گوشت کے لوتھڑے کی طرح ہلتا ہو گا۔ حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے یہ حدیث پاک حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنی ہے اور میں (یہ بھی) گواہی دیتا ہے کہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ الشریف کے ساتھ تھا جب ان لوگوں سے جنگ کی گئی، اس شخص کو مقتولین میں تلاش کیا گیا تو اس وصف کا ایک آدمی مل گیا جو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان فرمایا تھا۔

حوالہ جات:

البخاري في الصحيح، باب: ماجاء في قول الرجل ويلك، 2281/5، الرقم: 5811،

مسلم في الصحيح، باب: ذكر الخوارج وصفاتهم، 744/2، الرقم: 1064،

شامی باغیوں کی سفاکی پرانے زمانے کے خوارج کے ہاں بھی ملتی ہے۔ امام طبری، امام ابن الاثیر اور حافظ ابن کثیر روایت کرتے ہیں:۔

"پس خوارج نے حضرت عبداللہ بن خباب رضی اللہ عنہ کو چت لٹا کر ذبح کر دیا۔ آپ کا خون پانی میں بہہ گیا تو وہ آپ کی زوجہ کی طرف بڑھے۔ ان محترمہ نے کہا کہ میں عورت ہوں۔ کیا تم میرے معاملے میں اللہ سے نہیں ڈرتے۔ (لیکن خوارج پر کوئی اثر نہ ہوا) انہوں نے انکا پیٹ چاک کر ڈالا اور (ان شہیدوں سے ہمدردی کرنے والی) قبیلہ طے کی تین مزید خواتین کو بھی قتل کر ڈالا"۔

حوالہ: ابن الاثیر۔ الکامل فی التاریخ۔ ۳: ۲۱۹

طبری۔ تاریخ الامم والملوک، ۳: ۱۱۹

ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ۷: ۲۸۸

احادیث کی روشنی میں دہشت گرد (خارجیوں) کی علامات حسب ذیل ہیں:

أَحْدَاثُ الْأَسْنَانِ. ''ان میں کم سن لڑکے ہوں گے"۔

(بخاری، الصحیح، کتاب، 2539:6، رقم: 6531۔۔ مسلم، الصحیح، باب التحریض علی قتل الخوارج، 746:2، رقم: 1066)

سُفَهَاءُ الْأَحْلَامِ. "وہ احمق ہوں گے"۔

كَثُّ اللِّحْيَةِ. '' گھنی داڑھی رکھیں گے"۔

مُشَمَّرُ الْإِزَارِ. ''بہت اونچا تہ بند باندھنے والے ہوں گے"۔

يَخْرُجُ نَاسٌ مِنْ قِبَلِ الْمَشْرِقِ. ''یہ خارجی لوگ (حرمین شریفین سے) مشرق کی جانب (نجد) سے نکلیں گے"۔

لَا يَزَالُوْنَ يَخْرُجُوْنَ حَتّٰى يَخْرُجَ آخِرُهُمْ مَعَ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ. ''یہ ہمیشہ نکلتے رہیں گے یہاں تک کہ ان کا آخری گروہ دجال کے ساتھ نکلے گا"۔

لَا يُجَاوِزُ إِيْمَانُهُمْ حَنَاجِرَهُمْ. ''ایمان ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا"۔

يَتَعَمَّقُوْنَ وَيَتَشَدَّدُوْنَ فِي الْعِبَادَةِ. ''وہ عبادت اور دین میں بہت متشدد اور انتہاء پسند ہوں گے"

۔)عبدالرزاق، المصنف، 155:10، رقم: 18673(

يَحْقِرُ أَحَدُكُمْ صَلَاتَهُ مَعَ صَلَاتِهِمْ، وَصِيَامَهُ مَعَ صِيَامِهِمْ.

تم میں سے ہر ایک ان کی نمازوں کے مقابلے میں اپنی نمازوں کو حقیر جانے گا اور ان کے روزوں کے مقابلہ میں اپنے روزوں کو حقیر جانے گا۔ (صحیح البخاری باب: ماجاء في قول الرجل ويلك، 2281/5، الرقم: 5811)

لَا تُجَاوِزُ صَلَاتُهُمْ تَرَاقِيَهُمْ. ''نماز ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گی۔'' (مسلم، الصحیح، کتاب الزکاۃ، باب التحریض علی قتل الخوارج، 748:2، رقم: 1066)

يَقْرَئُوْنَ الْقُرْآنَ لَيْسَ قِرائَتُكُمْ إِلَى قِرَاءَ تِهِمْ بِشَيءٍ.

"وہ قرآن مجید کی ایسے تلاوت کریں گے کہ ان کی تلاوتِ قرآن کے سامنے تمہیں اپنی تلاوت کی کوئی حیثیت دکھائی نہ دے گی"۔

يَقْرَئُوْنَ الْقُرْآنَ لَا يُجَاوِزُ حُلُوْقَهُمْ. ’’ان کی تلاوت ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گی"۔

يَقْرَئُوْنَ الْقُرْآنَ يَحْسِبُوْنَ أَنَّهُ لَهُمْ، وَهُوَ عَلَيْهِمْ. ’’وہ یہ سمجھ کر قرآن پڑھیں گے کہ اس کے احکام ان کے حق میں ہیں لیکن درحقیقت وہ قرآن ان کے خلاف حجت ہوگا"۔

يَدْعُونَ إِلَى كِتَابِ االلهِ وَلَيْسُوا مِنْهُ فِي شَيْءٍ.(ابوداود باب فی قتل الخوارج)

"وہ لوگوں کو کتاب اللہ کی طرف بلائیں گے لیکن قرآن کے ساتھ ان کا تعلق کوئی نہیں ہوگا"۔

يَقُوْلُوْنَ مِنْ خَيْرِ قَوْلِ الْبَرِيَّةِ. ’’وہ (بظاہر) بڑی اچھی باتیں کریں گے۔‘‘(بخاری)

يُسِيْئُوْنَ الْفِعْلَ. ’’مگر وہ کردار کے لحاظ سے بڑے ظالم، خونخوار اور گھناؤنے لوگ ہوں گے۔‘‘(أبو داود، السنن، کتاب السنة، باب في قتال الخوارج، 4:243، رقم:4765)

هُمْ شَرُّ الْخَلْقِ وَالْخَلِيْقَةِ. ’’وہ تمام مخلوق سے بدترین لوگ ہوں گے۔‘‘(مسلم)

يَطْعَنُوْنَ عَلٰى أُمَرَائِهِمْ وَيَشْهَدُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالضَّلَالَةِ. ’’وہ حکومت وقت یا حکمرانوں کے خلاف خوب طعنہ زنی کریں گے اور ان پر گمراہی وضلالت کا فتویٰ لگائیں گے"۔

هيثمي، مجمع الزوائد، 6:228، وقال: رجاله رجال الصحیح.

يَخْرُجُوْنَ عَلٰى حِيْنِ فُرْقَةٍ مِنَ النَّاسِ. ’’وہ اس وقت منظرِ عام پر آئیں گے جب لوگوں میں تفرقہ اور اختلاف پیدا ہو جائے گا۔‘‘(متفق علیہ)

يَقْتُلُوْنَ أَهْلَ الإِسْلَامِ وَيَدْعُوْنَ أَهْلَ الْأَوْثَانِ. ’’وہ مسلمانوں کو قتل کریں گے اور بت پرستوں کو چھوڑ دیں گے۔‘‘(متفق علیہ)

يَسْفِكُوْنَ الدَّمَ الْحَرَامَ. ’’وہ ناحق خون بہائیں گے۔‘‘(مسلم)

"بہترین اشخاص کو قتل کریں گے۔"(ترمذی)

کلاب النار۔وہ جہنم کے کتے ہیں(السنن ابن ماجہ۔باب فی الذکر الخوارج۔ا:۶۲،رقم۔۱۷۶

حضور نبی اکرم ﷺ نے اپنی امت کو قیامت تک ہر دور میں خوارج کے ظاہر ہوتے رہنے اور منظم و مسلح گروہوں کی شکل میں نکلتے رہنے کی پیغمبرانہ پیش گوئی کے طور پر خبریں دے دی تھیں تاکہ ہر زمانے کے مسلمان انہیں پہچان سکیں۔

باب نہم: عرب بہار اور مشرق وسطیٰ کے شیعہ

مسلمانوں میں اختلافات صدیوں سے رہے ہیں مگر ان کے اظہار میں تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے۔ البتہ بعض اوقات بعض مولوی صاحبان نے ایسی کتابیں بھی لکھی ہیں جن میں دوسرے مسلمانوں کے بارے میں گھٹیا زبان استعمال کی گئی ہے۔ لیکن پرانے زمانے میں نشر و اشاعت کے وسائل محدود ہونے کی وجہ سے یہ چیزیں عوام کے عقائد کا حصہ نہیں بن سکیں۔ اس صدی میں میڈیا کے پھیلاؤ اور سوشل میڈیا کی ایجاد نے ایسے متعصب عناصر کی عوام تک رسائی کو آسان بنا دیا ہے۔ اب لندن میں بیٹھا یاسر الحبیب ہو یا سعودی عرب میں بیٹھا احمد العرعور، ان کیلئے آگ لگانا مشکل نہیں رہا ہے۔ 2010 میں ان فتنوں کی آہٹ پا کر آیت اللہ خامنہ ای نے درج ذیل فتویٰ دیا:۔

"اہل سنت بھائیوں کے مقدسات اور ام المومنین حضرت عائشہؓ کی توہین حرام ہے۔ یہی حکم باقی امہات المومنین اور باقی انبیاؑ کی ازواج مطہرات کیلئے بھی ہے"۔

سید علی خامنہ ای

(مہر و دستخط)

اسی طرح جامعہ الازہر سے مفتی اعظم شیخ الازہر احمد طیب صاحب نے اہل تشیع کے خلاف پھیلنے والی نفرت کے سد باب کیلئے معروف چنیل "النیل المصریہ" کو ایک تفصیلی انٹرویو دیا جس میں انہوں نے شیعہ مسلک کو باقی فقہی مسالک کی طرح امت کا حصہ قرار دیا اور بہت سے بے بنیاد الزامات کی تردید بھی کی۔ اس انٹرویو کا اردو ترجمہ انٹرنیٹ پر شایع ہو چکا ہے۔

ایسے اقدامات اور مسلمان عوام کے عمومی رجحان کی وجہ سے بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے فسادات تو شروع نہ کئے جا سکے، البتہ القاعدہ اور اخوان المسلمون جیسی فرقہ وارانہ تعصبات سے بھری تنظیمیں ان رہنماؤں کی بات اور اپنی عقل کی آواز کو اہمیت نہیں دے رہی تھیں۔ عرب بہار کے آغاز سے پہلے ہی عراق میں شیعوں پر حملے شروع ہو گئے۔ مثال کے طور پر فروری 2006 میں بم دھماکے کے ذریعے سامرا نامی قصبے میں امام العسکری کے روضے کو تباہ کر دیا گیا۔ اسی طرح 2007 میں تلعفر نامی قصبے میں خودکش حملہ کر کے 152 شیعہ قتل اور 347 معذور یا زخمی کر دیئے گئے۔ عراق میں صرف شیعہ نشانے پر نہیں تھے، اگست 2007 میں موصل کے قریب قحطانیہ اور عدنانیہ نامی قصبوں میں ایزدی

اقلیت پر بم دھماکے کر کے 500 افراد کو قتل اور متعدد کو زخمی کر دیا گیا۔ کتاب کے اختصار کے پیش نظر ایسے بے شمار حملوں میں سے ہر ایک کا یہاں ذکر نہیں کیا جاسکتا۔ یہ سلسلہ عرب بہار کے بعد مزید تیز ہو گیا۔

عرب بہار کے آغاز کو متعدد شیعوں نے باقی ہم وطنوں کی طرح تازہ ہوا کا جھونکا سمجھا۔ بحرین اور سعودی عرب کے شیعہ اپنے حقوق میں بہتری کیلئے قانونی اصلاحات کا مطالبہ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اہم شیعہ رہنماؤں نے عرب دنیا میں احتجاج کی لہر کو اسلامی بیداری قرار دیا۔ ایران یہ سمجھ رہا تھا کہ شمالی افریقہ میں اخوان المسلمون کی کامیابی سے آزادی اور استقلال آجائے گا، نیز عرب عوام کی ترجمان حکومتوں کے قیام سے مسئلہ فلسطین کے حوالے سے اس پر دباؤ کم ہو گا۔ چنانچہ 5 فروری 2011 کو تہران میں آیت اللہ خامنہ ای نے نماز جمعہ کے اجتماع سے خطاب کیا۔ اس خطاب کا خلاصہ درج ذیل ہے:۔

"آجکل دنیائے اسلام میں ایک عظیم اور تاریخی تحریک نے جنم لیا ہے جو خطے میں طاقت کے توازن کو اسلام اور عوام کے حق میں موڑ سکتی ہے۔ یہ تحریک تیونس سے شروع ہو کر مصر میں پہنچ گئی ہے، وہ مصر جو عظیم اسلامی شخصیات کو جنم دیتا رہا ہے۔ اس وقت سب کی نظریں مصر پر لگی ہیں جو سید جمال الدین افغانی، محمد عبدہ، احمد شوقی، حسن البنا اور جمال عبدالناصر کا ملک ہے۔ اگر اس وقت مصر کے عوام نے ہمت ہار دی تو ایک سیاہ دور شروع ہو سکتا ہے، لیکن اگر انہوں نے ہمت نہ ہاری تو عزت و عظمت کی بلندیوں تک پہنچ جائیں گے۔ تیونس کے عوام نے امریکی حمایت یافتہ حکومت کو گرادیا ہے مگر محض اس حکومت کا خاتمہ کافی نہیں ہے۔ یہ لوگ صرف اس نظام کے ظاہری مہرے تھے۔ اگر سابقہ نظام کو تبدیل نہ کیا گیا تو کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ ایران میں ہمارے انقلاب کے بعد بھی بہت کوششیں ہوئیں کہ مہرے ہٹائے جانے کے بعد پرانا نظام باقی رکھا جائے لیکن ہمارے عوام اور ہماری قیادت امام خمینی نے بصیرت کے ساتھ انکی چالوں کا مقابلہ کیا۔ مصر اسلامی ممالک میں سب سے نمایاں رہا ہے۔ اس ملک نے اسرائیل کے ساتھ کئی جنگیں لڑی ہیں اور یہ پہلا ملک تھا جو مظلوم فلسطینیوں کی مدد کو پہنچا تھا۔ عظیم تاریخی اور ثقافتی ورثے کی بدولت ماضی میں مصر کا کردار قائدانہ رہا ہے۔ مصر کے موجودہ حکمران (حسنی مبارک) نے سب سے بڑا جرم یہ کیا کہ مصر جیسے عظیم ملک کو امریکی مہرہ بنا کر رکھ دیا۔ فلسطین کا مسئلہ مشرق وسطیٰ کا اہم ترین مسئلہ ہے اور اس خطے کا کوئی ملک اس سے کٹ نہیں سکتا۔ اسی وجہ سے اس خطے کے عوام ایسی حکومتوں کی پشت پناہی کرتی ہیں جو فلسطینیوں کی ساتھ ہوں۔ بدنام زمانہ کیمپ ڈیوڈ معاہدے کے بعد سے مصری عوام نے اپنی حکومت سے منہ موڑ لیا ہے۔ اس معاہدے کے بعد

سے مصر اس علاقے میں اسرائیل کا سب سے بڑا دوست بن کر سامنے آیا ہے۔ حالانکہ اسی علاقے میں شام کی حکومت نے کامیابی سے امریکی دباؤ کا سامنا کیا ہے اور حق پر مبنی موقف سے روگردانی نہیں کی ہے۔ مصری عوام اب اسرائیل نوازی کو مزید برداشت نہیں کریں گے۔

عزیز بھائیو! اگرچہ ہر ملک کا سیاسی اور تاریخی پس منظر مختلف ہوتا ہے، پھر بھی بہت سے معاملات ایسے ہیں جن میں آپ کو ہمارے انقلاب کے تجربے سے کئی درس مل سکتے ہیں۔ ایک سبق تو یہ ہے کہ کسی بھی معرکے میں اہم ترین معرکہ اعصاب کی جنگ ہوتی ہے، اپنے اعصاب کو مضبوط رکھیں۔ دوسرا سبق یہ ہے کہ اپنے مستقبل کے بارے میں پر امید رہیں۔ تیسرا یہ کہ اسلحے سے خوفزدہ نہ ہوں۔ چوتھا یہ کہ آپس کا اتفاق واتحاد برقرار رکھیں، فرقہ وارانہ اور دیگر اختلافات کے ذکر اور نعروں سے دور رہیں۔ پانچواں سبق یہ ہے کہ دھوکے باز امریکا پر کبھی اعتماد نہ کریں۔ انکی سیاسی چالوں سے ہوشیار رہیں، وہ اس مہرے کو ہٹا کر دوسرا مہرہ لانا چاہیں گے۔ یہ آپ کے شعور کی توہین ہو گی۔ چھٹا سبق یہ ہے کہ جامعہ الازہر کو اس موقعے کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے قائدانہ کردار ادا کرنا چاہئیے۔ ساتواں سبق مصر کی فوج کیلئے ہے، وہ آپ کو عوام کے خلاف استعمال کرنا چاہیں گے مگر جان لیجئے کہ اپنے عوام سے ٹکرانے والی فوج تباہ ہو جاتی ہے۔ آخری بات یہ کہنا چاہوں گا کہ امریکا کسی معاملے میں ثالث بننے کا حق نہیں رکھتا۔ امریکا کے مشوروں اور اقدامات پر کڑی نظر رکھیں"۔

دو دن بعد، 7 فروری 2011 کو، لبنان میں حزب اللہ کے رہنما سید حسن نصر اللہ نے مصری عوام کے حق میں ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا:۔

"آج ہم مصری عوام اور نوجوان نسل کے ساتھ اظہار یکجہتی کیلئے اکٹھے ہوئے ہیں۔ مصر میں ایک خالص عوامی تحریک اٹھی ہے۔ اس میں اسلامی جماعتیں بھی شامل ہیں اور سیکولر بھی، اس میں مسلمان بھی شامل ہیں اور مسیحی بھی۔ بچے، جواں، مرد، خواتین، علماء، محققین، مزدور، کسان، غرض یہ کہ سب طبقات متحد ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ امریکی اور اسرائیلی میڈیا یہ کہہ رہا ہے کہ یہ تحریک محض غربت کے خلاف اٹھی ہے جبکہ حقیقت اتنی سادہ نہیں ہے۔ یہ ایک مکمل تحریک ہے جو سماجی انصاف، بہتر خارجہ پالیسی، بہتر معیار زندگی، آزادی اور جمہوریت، غرض معاشرتی زندگی کی تمام ابعاد سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں عوام محض غربت سے

تنگ ہو کر شامل نہیں ہوئے بلکہ اس میں نوجوان طالب علم بھی شامل ہیں جو ملک کے مستقبل کو روشن دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس میں شامل لوگ مصر کی عزت کی بحالی اور آزادی چاہتے ہیں۔ یہ تحریک اسرائیلی مفادات کا تحفظ کرنے والی حکومت کے خلاف اٹھی ہے۔ ہم سب کی ذمہ داری ہے کہ اس تحریک کی حمایت کریں۔

کچھ لوگ کہہ رہے ہیں کہ اس تحریک کو امریکی ایجنسیوں نے شروع کیا ہے، یہ غلط ہے۔ آخر امریکی کیوں اپنے مہروں کے خلاف انقلاب برپا کریں گے؟ ہاں یہ بات صحیح ہے کہ اب امریکی اس تحریک کی کشتی پر سوار ہو کر اس کا رخ موڑنا چاہتے ہیں۔ کئی عشروں سے مصری عوام کو یرغمال بنانے والا امریکا اس تحریک کو اغوا کرنا چاہتا ہے جو کہ بہت بڑا خطرہ ہے۔ سب متعلقہ لوگوں کو امریکا سے ہوشیار رہنا چاہئیے۔

اس خطے کے عوام امریکا کو پسند نہیں کرتے، آج تک کئے جانے والے تمام سروے اس حقیقت کے گواہ ہیں۔ البتہ ہمارا امریکی عوام سے کوئی جھگڑا نہیں، ہمارا جھگڑا امریکی حکومت سے ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ امریکی عوام کو اندھیرے میں رکھا جاتا ہے۔ ہمارے علاقے کے عوام کا امریکا مخالف ہونا اس وجہ سے ہے کہ امریکا نے ہمیشہ اسرائیل کا ساتھ دیا ہے، ہر جنگ اور ہر جرم میں۔ خود امریکا نے بھی عراق اور افغانستان میں لاکھوں مسلمانوں کا قتل عام کیا ہے۔

یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ امریکا کو اس علاقے میں سب سے زیادہ عزیز اسرائیل ہے۔ امریکا کو اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ اس تحریک کے نتیجے میں کون سا شخص یا جماعت حکومت میں آتی ہے، ان کو اس بات سے غرض ہے کہ وہ حکمران اسرائیل کے مفادات کا خیال رکھے گا یا نہیں؟ مذہبی جماعت ہو، بائیں بازو کی جماعت ہو، سیکولر لوگ ہوں یا نیشنلسٹ لوگ ہوں، مسلمان حکمران ہو یا مسیحی، امریکا کا اس سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ امریکا ہر اس شخص یا جماعت کی حمایت کرے گا جو اسرائیل کی حمایت کرے۔ مصر میں تحریک کے آغاز کے بعد سے اسرائیل ڈر گیا ہے۔ وہ اس وقت حسنی مبارک کی حکومت کو بچانے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے۔ جو عرب حکومتیں حسنی مبارک کی حمایت کر رہی ہیں میں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ اسرائیل کے ساتھ ہیں یا مصری عوام کے ساتھ؟ یہ تاریخی لمحات مسلمانوں کے مستقبل کا سوال ہیں، آپ کس کے ساتھ ہیں؟

اب میں اپنے مصری بھائیوں سے کچھ باتیں کہنا چاہوں گا۔ آپ جو کچھ کر رہے ہیں وہ ایک عظیم کام ہے۔ یہ ایک تاریخی لمحہ ہے اور آپ کے فیصلے اس خطے کی تقدیر بدل سکتے ہیں۔ آپ مصر کو اسکا پرانا قائدانہ کردار واپس دلوا سکتے ہیں۔ کاش ہم بھی اس وقت آپ کے ساتھ ہوتے اور اور آپ کے ساتھ ہم بھی اپنی جانوں کی قربانی دیتے"۔

مگر اس وقت مصر میں رہنمائی کیلئے کوئی محمد علی جناح یا مولانا ابو الکلام آزاد موجود نہیں تھا جو ان نازک مراحل میں بصیرت کا چراغ جلا سکتا۔ عرب بہار کسی سیاسی ارتقا کا نتیجہ نہیں تھی۔ حادثاتی اور بے سمت تحریک کی مہاریں سوشل میڈیا پر بیٹھے ناپختہ اور نیم خواندہ حضرات کے ہاتھ میں تھیں جو سیاست حاضرہ کے لطیف حقائق سے آشنا نہیں تھے۔ وہ بڑی طاقتیں جنہوں نے اس علاقے کو کئی صدیوں سے اپنے اشاروں پر چلایا تھا، بڑی مہارت سے اس طوفان کا رخ متعین کرنے لگیں۔ نشریات اور ابلاغ، اسلحے کی تقسیم، نعروں کا انتخاب، جلسے جلوسوں کے انتظامات، سوشل میڈیا اور موبائل فون پر عوام کو دی جانے والی ہدایات، کھمبی کی طرح اگتی قیادتیں، سب پر امریکا آسانی سے سوار ہو گیا۔

مصر میں انتخابات ہوئے اور معمولی اکثریت سے اخوان المسلمون جیت گئی۔ کچھ ہی عرصے میں اخوان المسلمون کا کھوکھلا پن، قحط الرجال اور نااہلی سامنے آگئی۔ مصر کی ہزاروں سال پرانی تاریخ میں پہلی بار عوام نے کسی سربراہ کو چنا تھا۔ اس سربراہ نے ملک کا آئین بنانا تھا۔ اس نے خارجہ پالیسی مرتب کرنا تھی۔ مصر کو اس تاریخی موقعے پر ایک ایسے قائد کی ضرورت تھی جو جدید دنیا کی تاریخ سے آگاہ ہو اور بین الاقوامی تعلقات کی باریکیوں سے واقف ہو۔ جو سیاسی تجزیہ و تحلیل کر سکتا ہو اور بصیرت پر مبنی فیصلے کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ ایسے وقت میں کم از کم کسی تاریخ کے استاد، یا ماہر سیاسیات، یا کسی ذہین قانون دان کی ضرورت تھی۔ اخوان المسلمون نے صدارت کیلئے مرسی کو نامزد کیا جو دھاتوں کا انجنیئر تھا۔ اس بیچارے کو کسی سٹیل مل کے بجائے حکومت کا انتظام تھما دیا گیا۔ مرسی کی قیادت میں اخوان المسلمین نے ہر وہ کام کیا جو نہیں کرنا چاہئیے تھا۔ سب سے پہلے اسرائیل کے ساتھ تعلقات بحال کیئے، جس سے مصری عوام میں بے چینی پھیل گئی۔ اس کے بعد سارے اہم حکومتی عہدے صرف اپنے لوگوں میں بانٹے۔ خارجہ پالیسی میں مرسی صاحب نے ایران اور شام سے پنگا لینا شروع کر دیا، وجہ یہ تھی کہ ان کا فرقہ ان موصوف کے فرقے سے الگ تھا۔ عرب بادشاہوں اور امریکا کے قریب ہوئے۔ قانون بنانے کی باری آئی تو کسی جماعت کو شریک نہ کیا بلکہ اپنی مرضی کا قانون بنا کر پاس کروا دیا۔ حالانکہ انکی جماعت کو معمولی اکثریت ملی تھی اور قومی آئین جیسے معاملے میں قوم کے تمام طبقات کی شمولیت ضروری تھی۔ مرسی یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ حکومت ملنے کے بعد وہ صرف اخوان المسلمون کا کارکن نہیں بلکہ پورے مصر کا صدر تھا، ان لوگوں کا بھی جنہوں نے اسکو ووٹ نہیں دیئے تھے۔ ایسے اقدامات سے انقلاب کے دنوں

میں پیدا ہونے والی قومی یکجہتی ختم ہو گئی اور حکومت کا ایک سال مکمل ہوتے ہی جون 2013 کو قاہرہ میں پہلے سے بھی بڑے مظاہرے شروع ہو گئے۔ مصر پر دوبارہ مارشل لاء نافذ ہو گیا۔

جوں جوں وقت گزرا، عرب بہار مشرق وسطیٰ کے شیعوں کے لیے بقا کے مسائل کھڑے کرنے لگی۔ دلوں میں تعصب رکھنے والے لوگ ملکی تعمیر و ترقی کے اہداف کو بھلا کر شیعہ کشی میں مشغول ہو گئے۔ عرب بہار کا رخ آپس کی جنگ کی طرف موڑا جا چکا تھا۔ اخوان المسلمون کے حکومت سنبھالتے ہی مصر بھر میں شیعہ مخالف تقریریں عام ہو گئیں۔ 24 جون 2013 کو قاہرہ کے نواحی گاؤں میں ایک شیعہ مجلس پر حملہ کر کے شیخ حسن شحاتہ نامی شیعہ خطیب سمیت چار افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ مصر میں پانچ سے دس لاکھ کے قریب شیعہ لوگ بستے ہیں جو روایتی نفرت کا نشانہ تو پہلے بھی بنتے رہتے تھے مگر یہ قتل کا واقعہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد تھا۔ مصر میں وہی سب ہونے لگا تھا جو آزادی کے بعد سے ہی پاکستان میں ہو رہا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الشریف کا قول ہے کہ قدرت اور اقتدار ملنے پر لوگ بدلتے نہیں، بے نقاب ہوتے ہیں۔ عرب بہار جب شام میں داخل ہوئی تو تھوڑی سی کامیابی کی امید ملتے ہی القاعدہ کے باغی اسرائیل کی حمایت کے اعلانات کرنے لگے اور حزب اللہ اور ایران کو آگ لگانے جیسی سنگین دھمکیاں دینے لگے۔ ان لوگوں نے لبنان میں شیعہ آبادیوں پر خود کش حملے کئے۔ حزب اللہ اور ایران تو طاقتور تھے اور اپنا دفاع کر سکتے تھے، ان کے بارے میں ایسی سوچ رکھنے والوں کے اپنے ملک کی اڑھائی لاکھ شیعہ آبادی کے بارے میں کیا جذبات ہوں گے؟ شیعوں کیلئے دو راستے تھے، یا گھروں میں بیٹھ کر قاتلوں کا انتظار کریں یا اس حکومت کا ساتھ دیں جس نے نہ صرف عوام میں کبھی مذہبی تعصب روا نہیں رکھا بلکہ اسرائیل کے مقابلے میں مزاحمت کا مرکز ہے۔ یہی سوال شام میں بسنے والے معتدل سنیوں، فلسطینی مہاجروں، علویوں، دروز، مسیحیوں اور کردوں کیلئے بھی تھا۔ شیعوں سے سلوک کی ایک مثال ادلب میں موجود فوعہ اور کفرایا نامی شیعہ قصبوں کی ہے جو سات سال سے مسلسل محاصرے اور حالت جنگ میں ہیں۔ ان قصبوں میں کھانے پینے کی اشیا اور ادویات مرکزی حکومت کبھی کبھی ہیلی کاپٹر کے ذریعے پہنچاتی ہے۔ روز روز کے مارٹر گولے گرنے سے کئی مکانات تباہ اور بے گناہ لوگ قتل ہو چکے ہیں۔ شام میں شیعہ آبادی کے ساتھ باغیوں نے کیا کیا ہے یہ تو جنگ کے بادل چھٹنے کے بعد ہی پوری طرح واضح ہو گا۔ اس سلوک کے بعد شیعہ ان کا ساتھ کیسے دے سکتے ہیں؟

عراق میں عرب بہار شیعوں کو بہت مہنگی پڑی ہے۔ داعش نے سب سے زیادہ جس طبقے کو نقصان پہنچایا ہے وہ شیعہ ہیں۔ بطور مثال 15 جون 2014 کو موصل میں انہوں نے فوجی تربیتی ادارے کے طلبہ کو باہر نکالا۔ جو طلبہ سنی تھے انھیں دوبارہ کلمہ پڑھا کر چھوڑ دیا لیکن 1700 شیعہ لڑکوں کو قطار میں لٹا کر ذبح کیا اور لاشیں دریا میں بہا دیں جس سے

دریا کا پانی سرخ ہو گیا۔ یہ سب بیس سے بائیس سال کے جواں تھے جن کی مائیں جیتے جی مر گئیں۔ شیعوں کو ایک قطار میں لٹا کر گولی مارنے والی ویڈیوز تو داعش کی ابتدائی پروپیگنڈا ویڈیوز تھیں اور یہ اس قدر عام ہوئی تھیں کہ اس گروہ کا ٹریڈ مارک بن چکی ہیں۔ اس وقت پاکستان میں موجود ان لوگوں کے حمایتیوں نے بہت خوشی کا اظہار کیا تھا۔ یہاں سوشل میڈیا پر جنونی حضرات شیعوں کو دھمکیاں دیا کرتے تھے کہ عنقریب پاکستان میں بھی یہی کریں گے۔ کربلا اور نجف میں موجود شیعہ تہذیب کے آثار اور مراکز کو کفر کا مرکز کہہ کر ان کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی وکالت کی جاتی تھی۔ ادھر امام ابو حنیفہ (رح) اور حضرت عبدالقادر جیلانی (رح) کے مزارات خطرے میں تھے۔ شام میں حضرت زینب (س) کے روضے کو گرا کر انکی قبر چاک کرنے کی بات ہونے لگی۔ مفتی احمد العرعور اور شیخ احمد الاسیر صاحب کی تصویریں پاکستانی سوشل میڈیا پر پھیل گئیں۔ داعش نے کربلا، نجف، بغداد جیسے شیعہ اکثریت کے علاقوں پر علاقوں میں کئی خود کش حملے کئے۔ داعش بغداد کے دروازے پر تھی جہاں سے اس نے کربلا اور نجف کی طرف ہی جانا تھا۔ اب عراق کے شیعوں پر بقا کی جنگ مسلط ہو چکی تھی۔ انہوں نے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر قتل عام کا انتظار کرنے کے بجائے مزاحمت کا آغاز کیا۔

آیت اللہ علی سیستانی کے اذن جہاد کے بعد عراق میں حشد الشعبی کا قیام عمل میں آیا اور ایران کے جنرل قاسم سلیمانی کا میڈیا میں تذکرہ ہونے لگا۔ یہ وہ اقدامات تھے جنہوں نے ان مقامات اور شہریوں کی حفاظت کی۔ اگر داعش شیعہ حضرات پر یہ جنگ مسلط نہ کرتی تو شیعوں کو اپنے بچے محاذ جنگ پر بھیجنے کی ضرورت نہ ہوتی، وہ حشد الشعبی میں جانے کے بجائے پہلے کی طرح اپنی تعلیم، کاروبار اور شادی بیاہ کی فکر کرتے۔

پاکستان میں جماعت اسلامی جیسی فرقہ پرست تنظیموں اور اوریا مقبول جان جیسے جنونی لکھاریوں نے شام کے بحران کے تناظر میں پاکستانی شہریوں میں نفرت کا تنور بھڑکا رکھا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں صیہونی منصوبوں کے بارے میں قرآن کے محکم احکامات اور اس علاقے کی تاریخ کو چھپا کر آخری زمانے والی احادیث میں آنے والی تشبیہات کو اپنی مرضی کے معانی پہنائے جا رہے ہیں۔ حالانکہ یہ علاقہ متعدد بار جنگوں میں الجھا رہا ہے۔ اگر ہم صلیبی جنگوں اور جنگ ہائے عظیم کا ذکر نہ بھی کریں تو چار مرتبہ عرب اسرائیل جنگ میں امریکا اور روس اسی طرح ٹکرا چکے ہیں۔ ممکن ہے مزید پانچ سو یا دس ہزار سال تک آخری زمانہ نہ آئے۔ لیکن یہ حضرات پھر بھی قیامت کا نقارہ بجاتے رہتے ہیں۔

جماعت اسلامی کے سوشل میڈیا ونگ سے منسلک ملازمین اپنی ذاتی نشست و برخاست اور غیر رسمی سوشل میڈیا پر فرقہ وارانہ جنون اور دروغ گوئی کے سب سے بڑے مظہر ہیں۔ قیادت اور کارکنان کے کردار کا تضاد اور رسمی و غیر رسمی نمائندوں کی منافقت ہی جماعت اسلامی کی ناکامی کی وجہ ہے۔ عوام قیادت کے منافقانہ بیانات کے بجائے کارکنان کے

عمل کو دیکھ کر جماعت اسلامی سے خوفزدہ ہیں۔ جس وقت قاضی حسین احمد ملی یکجہتی کونسل میں بیٹھے تھے اسی وقت پنجاب یونیورسٹی کے لاء کالج میں جماعت اسلامی کی بغل بچہ تنظیم اسلامی جمیعت طلبہ کا سابقہ ناظم اکرم لاہوری سپاہ صحابہ کا لیبل لگا کر معروف اردو شاعر محسن نقوی کو شیعہ ہونے کی وجہ سے قتل کر رہا تھا۔

تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ اسلامی خلافت کے یہ داعی اپنے ساتھ رہنے والے دوسرے مسالک کے خون کے اتنے پیاسے کیوں ہیں؟ جہاں یہ بات غیر انسانی ہے وہاں احمقانہ بھی ہے۔اس حماقت کا ایک ہی نتیجہ ہے اور وہ ہے بدامنی اور غربت۔ایسے معاشرے عالمی طاقتوں کی مصنوعات کی منڈی بن کر رہ جاتے ہیں۔وہ اپنی ضرورت کی ادویات اور مشینری کیلئے مستحکم معاشروں کے محتاج ہوتے ہیں۔

باب دہم: پاکستان کو درپیش خطرات

ہمارا پیارا وطن پاکستان جس محل وقوع میں قائم ہوا وہاں کئی ثقافتیں اور سولہ مادری زبانیں پائی جاتی ہیں۔ شام کی طرح پاکستان بھی ایک کثیر الثقافتی ملک ہے۔ پاکستان میں بسنے والی مختلف اقوام کے لباس، کھانے، رہن سہن اور خوشی و غم کے اظہار کے طریقوں نے اس کو ایک خوبصورت گلدستے کی شکل دی ہے۔ پاکستان کے موجودہ حالات اور اسکو درپیش خطرات کو سمجھنے کیلئے اس محل وقوع کی تاریخ کو سمجھنا ضروری ہے۔

ہمارے علاقے میں دہشتگردی کی ابتدا سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل دہلوی نامی دو مولوی صاحبان نے کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پورے ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی مگر پنجاب اور پختون خواہ کے علاقوں میں سکھوں کا دور چل رہا تھا۔ عرب دنیا میں 1802ء میں وہابی لشکر نے کربلا اور نجف پر حملہ کیا اور وہاں آئمہؑ کے مزارات کی تخریب کے ساتھ پانچ ہزار شیعہ مسلمان قتل کئے۔ 1804ء میں اس لشکر نے مدینہ پر بھی حملہ کیا اور روضۂ رسولؐ کی توہین کی۔ ان حرکتوں کی وجہ سے عالم اسلام میں اس تحریک کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہوئے، لیکن ان کاروائیوں کا اثر شاہ ولی اللہ کے خاندان کے بعض افراد پر یوں پڑا کہ ان کے متعصبانہ اور سطحی تصورات سے ابھرنے والے متشدد ذہن کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ برصغیر میں داعش کی طرز کی ریاست بنانے کی کوشش سب سے پہلے 1820ء کی دہائی میں سید احمد بریلوی، شاہ اسماعیل دہلوی اور مولوی عبد الحئی نے کی۔ ان میں سے شاہ اسماعیل دہلوی شاہ عبد العزیز کے بھتیجے اور مولوی عبد الحئی، شاہ عبد العزیز کے داماد تھے۔ ان تین حضرات کا کردار اس خطے کی مذہبی تاریخ میں بہت اہم ہے، جس کا اثر آج بھی بھارت کے صوبوں اترپردیش اور ہریانہ کے ساتھ ساتھ پاکستان کے پختون اور مہاجر اکثریت والے علاقوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ 1786ء میں پیدا ہونے والے سید احمد بریلوی نے پہلے عالم دین بننے کی کوشش کی مگر آٹزم (Autism) کا مریض ہونے کی وجہ سے پڑھ لکھ نہ سکے اور پانچ سال زور لگانے کے بعد مدرسہ ترک کر دیا۔ 1811ء میں امیر خان نامی ڈاکو کے لشکر میں شامل ہوئے جس نے سات سال بعد انگریزوں سے معاہدہ کر کے ہتھیار ڈال دیئے اور آپ بیروزگار ہو گئے۔ اب سید احمد نے بھی لاشعوری طور پر امیر خان ڈاکو کی طرح ریاست قائم کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ نیم خواندہ حضرات میں دین یا آئیڈیالوجی کے نام پر اقتدار کے حصول کی نفسیات بہت پیچیدہ ہے۔ یہ لوگ خود راستی کے احساس کا شکار ہو کر کسی قسم کا ظلم اور غلطی کرنے سے نہیں چوکتے۔ ہمارے زمانے میں اسکی ایک مثال کمبوڈیا کے پول پاٹ، اور عراق و شام کے ابو بکر بغدادی کی ہے۔ اس مہم میں اہم موڑ شاہ اسماعیل اور مولوی عبد الحئی کا اپنے آپ کو سید احمد کی مریدی میں دینا تھا۔ یہ دونوں سید احمد سے ہر لحاظ سے بہتر تھے، چنانچہ سید احمد میں یہ مالیخولیا پیدا ہوا کہ وہ خدا کی طرف سے چنے ہوئے اور ایک مشن پر مامور کئے گئے ہیں۔ مذہبی دنیا میں کم علمی کی وجہ سے کوئی مقام نہ ہونے اور پیٹ کی بھوک نے اس مالیخولیا کو اور ہوا دی۔ وہ مفتی بن کر عزت و معاش نہ کما سکے تو امیر صاحب بن

کر مفتیوں سے بھی آگے نکل سکتے تھے۔ سید احمد کی شخصیت کا نفسیاتی تجزیہ آج کل کے دہشتگردوں کو سمجھنے کیلئے بہت ضروری ہے کیوں کہ ان لوگوں کو بھی جب جہالت، غربت اور اکابر کی حمایت کی مثلث کا سامنا ہوتا ہے تو انکی نفسیاتی کیفیت بھی ویسی ہی ہو جاتی ہے۔ کوئی بھی انسان محض حوروں سے مجامعت کیلئے خود کشی نہیں کرتا [ڈاکٹر مبارک علی، **"المیہ تاریخ"**، حصہ اول، باب 11 جہاد تحریک، تاریخ پبلیکیشنز، لاہور]۔

اب اس تحریک کے دوسرے رخ، یعنی شیعہ مخالف تشدد کی طرف آتے ہیں۔ شاہ اسماعیل نے اپنی کتب میں اہل سنت کو عزاداری پر حملے کیلئے اکسایا اور کہا کہ تعزیہ توڑنے کا ثواب بت شکنی جیسا ہے۔ شاہ عبدالعزیز اپنی زندگی کے آخری سالوں میں تھے، ان کے ہاں نہ صرف محرم میں مجلس ہوتی تھی (فتاویٰ عزیزی میں 1238 ہجری یعنی سن 1818ء میں ایک سوال کے جواب میں ایسی مجلس کا ذکر موجود ہے) بلکہ وہ بی بی فاطمہؑ کی نیاز بھی دیا کرتے اور انہوں نے اپنی کتاب **"سر الشہادتین"** میں کربلا کی یاد منائے جانے کو خدا کی طرف سے پیدا کردہ اسباب شہرت قرار دیا تھا۔ سید احمد نے ان کے گھر میں نیاز دلانے کے سلسلے کو بھی بند کروا دیا۔ اس سے پہلے محرم میں تعزیہ، اہلبیت کا ذکر اور نیاز شیعہ و سنی کیلئے مشترک عمل تھا۔ سید احمد بریلوی نے سہارن پور میں تعزیے کو آگ لگوا دی۔ اس توہین کی وجہ سے اہل تشیع میں اشتعال پھیل گیا اور انہوں نے اس فتنے کے خلاف فیصلہ کن کاروائی کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ اس تیاری کی خبر ملنے پر انگریزوں نے سید احمد اور ان کے مریدوں کو سہارن پور سے علاقہ بدر کر دیا۔ سید احمد جب بریلی گئے تو وہاں بھی عزاداری کے خلاف جلسے اور تقریریں کیں جن کے رد عمل میں اہل تشیع نے تبرا کا جلوس نکالنے کا اعلان کر دیا۔ صفوی دور کی شروع کردہ بدعت ہندوستان میں بھی آنے والی تھی مگر اودھ کے نواب غازی الدین حیدر اور آیت اللہ سید دلدار علی نقویؒ نے اہل تشیع کو اس حرکت سے باز رکھا۔ 1817ء سے 1820ء تک مختلف شہروں میں پھر کر فساد پھیلانے کے بعد چار سو عقیدت مندوں کو لے کر سید احمد 1821ء میں حج کرنے چلے گئے۔ راستے میں بنارس کے مقام پر اہلسنت کے زیر انتظام امام بارگاہوں پر حملہ کیا اور تعزیے جلائے۔ پٹنہ میں بھی یہی کام کیا اور وہاں کے انگریز مجسٹریٹ نے اہل تشیع کے احتجاج کے باوجود اس ٹولے کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی۔

[Barbara Metcalf, "**Islamic revival in British India: Deoband, 1860-1900**", pp. 46-86, Princeton university Press (1982)]

اب اس تحریک کے تیسرے رخ کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو لوگ طالبان اور القاعدہ کے امریکہ کے ساتھ عجیب وغریب گٹھ جوڑ کو سمجھنا چاہتے ہیں انہیں شاہ ولی اللہ کے خاندان کے اقدامات اور انگریزوں کے مفادات کے درمیان غیر مستقیم تعلق کو سمجھنا ہوگا۔ انگریز اس وقت دنیا بھر میں پھیلے ہوئے تھے۔ وہ اکبر کے زمانے سے ہندوستان کے معاشرے کے بارے میں معلومات جمع کر رہے تھے اور کتب لکھ رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ عرب ممالک میں وہابی تحریک اور

ہندوستان میں شاہ ولی اللہ کے خاندان کی تحریک ان معاشروں کو اسی طرح کھوکھلا کرے گی جیسے یورپ میں 1522ء میں چھڑ کر 1618ء سے 1648ء تک عروج پر پہنچنے والی فرقہ وارانہ جنگوں نے مغربی معاشروں کو کیا تھا۔ لہٰذا جس طرح انہوں نے حجاز میں وہابی تحریک کی حمایت کی اسی طرح ان حضرات کو بھی اپنی نظر میں رکھتے ہوئے کھلی چھٹی دی۔ بات واضح تھی، سید احمد جیسے انگریزوں کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے البتہ ان کو اپنے جاسوسوں کی مدد سے ورغلا کر اس زمانے میں انگریزوں کے دشمن سکھوں کے خلاف استعمال کیا جا سکتا تھا۔ سید احمد کو لشکر سازی میں امیر خان ڈاکو نے بہت مدد فراہم کی، جو کچھ عرصہ قبل انگریزوں سے معاہدہ کر کے ہتھیار پھینکنے کے بدلے جائیداد حاصل کر چکا تھا۔ اس طرح اس شخص کو سہولت کار کے طور پر استعمال کر کے انگریز اس ساری تحریک کو اپنے انگلیوں پر نچا رہے تھے۔ یہ لوگ شمالی ہندوستان میں لشکر بنا کر جہاد کیلیئے راجستھان، بلوچستان اور افغانستان کا تین ہزار میل لمبا سفر کر کے سکھوں کی کمر میں خنجر مارنے پختون علاقوں میں پہنچ گئے۔ اس وقت سندھ میں شیعہ تالپور خاندان انگریزوں سے بر سر پیکار تھا مگر ان مجاہدین نے انکی کوئی مدد نہ کی۔ شاہ اسماعیل دہلوی کے الفاظ میں :۔

"انگریزوں سے جہاد کرنا کسی طرح واجب نہیں۔ ایک تو ان کی رعیت ہیں دوسرے ہمارے مذہبی ارکان کے ادا کرنے میں وہ ذرا بھی دست اندازی نہیں کرتے۔ ہمیں ان کی حکومت میں ہر طرح کی آزادی ہے بلکہ ان پر کوئی حملہ آور ہو تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس سے لڑیں اور اپنی گورنمنٹ پر آنچ نہ آنے دیں"۔ [مولانا جعفر تھانیسری، "حیات سید احمد شہید" ص 293]

اس تحریک کا چوتھا رخ خود اہلسنت میں تفرقہ ایجاد کرنا ہے۔ ان لوگوں نے اپنی دانست میں خدا کی شان بیان کرنے کیلیئے رسول اللہ (ص) کی شان میں توہین آمیز باتیں کیں۔ اس کام کا نتیجہ یہ ہوا کہ متعدد سنی علماء نے ان کے افکار کے خلاف رسالے لکھے، جن میں علامہ فضل حق خیر آبادی، مولانا عبدالمجید بدایونی، مولانا فضل رسول بدایونی، مفتی صدر الدین آزردہ، مولانا محمد موسیٰ اور مولانا ابوالخیر سعید مجددی نمایاں تھے۔ مولانا فضل حق خیر آبادی نے ایک پوری کتاب **"تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ"** لکھی۔ ان بزرگوں کے پیروکار بعد میں امام احمد رضا خان بریلوی کی نسبت سے بریلوی کہلائے۔

1826ء میں یہ لوگ پختون علاقوں میں طالبانی ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ کوئی ایسی ریاست نہیں تھی جو انسانی سرمائے کو استحکام اور آزادی کی فضا مہیا کر کے عوام کی زندگی میں بہتری لاتی، غربت اور بیماریوں کا خاتمہ کرتی۔ اس زمانے میں مغرب میں صنعتی اور طبّی انقلاب کا آغاز ہو چکا تھا جس نے آگے چل کر دنیا بھر کی منڈیوں پر قبضہ جمایا، ادھر مسلمان معاشرے کو ایسی جونکوں نے آلیا تھا۔ پشتون علاقوں میں انہوں نے فقہ حنفی کو وہابی عقائد کے ساتھ ملا کر نافذ کیا۔ پختون تہذیب پر حملے کرنے کے ساتھ ساتھ یہ حکم دیا کہ کوئی بالغ لڑکی شادی کے بغیر نہیں ہونی چاہیئے۔ سید

احمد کے کارندے باجماعت نماز میں شریک نہ ہو سکنے والے شخص کو کوڑے لگاتے۔ انہوں نے بنگال و بہار سے لائے گئے "مجاہدین" کی مقامی لڑکیوں سے زبردستی شادیاں کیں۔ پختون علاقوں میں عوام آہستہ آہستہ ان کے خلاف ہو گئے تو شاہ اسماعیل دہلوی نے کہا:۔

"آن جناب (سید احمد بریلوی) کی اطاعت تمام مسلمانوں پر واجب ہو گئی ہے۔ جس کسی نے آں جناب کی امامت قبول کرنے سے انکار کیا تو وہ باغی ہے، اس کا خون حلال ہے اور اس کا قتل کفار کے قتل کی طرح عین جہاد ہے اور اس کی ہلاکت تمام اہل فساد کی ہلاکت کہ یہی اللہ کی مرضی ہے۔ چوں کہ ایسے اشخاص کی مثال حدیثِ متواترہ کی رو سے جہنم کے کتوں اور ملعون شریروں جیسی ہے۔ یہ اس ضعیف کا مذہب ہے، پس اس ضعیف کے نزدیک اعتراض کرنے والوں کے اعتراض کا جواب تلوار کی ضرب ہے"۔[مکاتیبِ سید احمد شہید، مخطوطہ عکسی ایڈیشن، صفحہ 75]

پاکستان میں تکفیری دہشتگرد انکے افکار سے مکمل مماثلت رکھتے ہیں، کیونکہ اسلامیات اور تاریخ کے نصاب میں انکی مدح کی گئی ہے۔ آخر کار 1831ء میں سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل کو بالاکوٹ میں پختونوں نے سکھوں کے ساتھ مل کر قتل کیا۔ انکے مریدوں نے ان کے بارے میں عجیب و غریب مگر غیر قابل تصدیق کرامات وضع کیں جن کو سو سال بعد مرزا حیرت دہلوی جیسوں نے اپنی کتابوں میں درج کیا۔

رنجیت سنگھ کی وفات اور پنجاب کے انگریزوں کے ہاتھوں فتح ہونے کے بعد انگریزوں نے سید احمد کی تحریک مجاہدین کی باقیات کا صفایا کر دیا: ان کی پشت پناہی کا مقصد ختم ہو چکا تھا۔ حنفیت، تصوف اور خارجیت کا یہ ملغوبہ بعد ازاں 1867ء میں دارالعلوم دیوبند کے قیام کی شکل میں سامنے آیا۔ دیوبندی مکتبہ فکر میں سید احمد بریلوی کی تکفیری سوچ کو اپنانے کا رجحان اس مکتبہ فکر کی تشکیل کے ابتدائی دنوں سے موجود تھا۔ یہ رجحان پیر امداد اللہ مہاجر مکی، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا قاسم نانوتوی کی تحریروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ پیر امداد اللہ مہاجر مکی بھی نیم خواندہ تھے اور انکے بقول وہ سید احمد بریلوی کو خوابوں میں ملتے رہے،اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انکے ذہن پر سید احمد بریلوی کا اثر کتنا گہرا تھا؟

1929ء میں لاہور میں دیوبندی علماء مولانا عطاءاللہ شاہ بخاری، مولانا مظہر علی اظہر اور مولانا ظفر الملک نے **"مجلس احرار"** نامی غنڈہ گرد تنظیم بنائی۔ مولانا مظہر علی اظہر سابقہ شیعہ تھے جنہوں نے بعد میں دیوبندی مسلک اختیار کر لیا تھا۔ یہ سپاہ صحابہ عنصر کا ابتدائی ظہور تھا۔ 1936ء میں مجلس احرار نے محرم میں مدح صحابہ کے عنوان سے جلوس نکالنے کی اجازت لینے کیلئے ہنگامے شروع کئے۔ اس بدعت کا مقصد محرم میں شیعہ سنی فساد پیدا کرنا تھا۔ یہ لوگ صدیقی سنی نہ تھے بلکہ اموی سنی تھے۔ بنی امیہ کے خلاف مزاحمت کو ابن سبا نامی نو مسلم کی سازش قرار دیتے لیکن بنی امیہ کے خلاف آل ابو بکرؓ میں سے حضرت عائشہؓ، حضرت عبدالرحمن ابن ابو بکرؓ، حضرت محمد ابن ابو بکرؓ اور حضرت عبداللہ ابن

زبیرؓ کی مزاحمت کو چھپاتے تھے۔ مولانا مظہر علی اظہر نے عین روز عاشور کو قصیدہ "ولیوں کے سر کا تاج ہے معاویہ، چبھتا ہے رافضی کو نظام معاویہ" پڑھ کر اہل تشیع کو اشتعال دلایا۔انہوں نے شیعوں کے خلاف ایک کتاب بعنوان **"تحریک مدح صحابہ"** بھی لکھی۔ اسکے باوجود مجلس احرار عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کیلئے مولانا مظہر علی اظہر کو شیعہ کہتی تھی۔ حالانکہ وہ اتنے ہی شیعہ تھے جتنے مولانا مقبول دہلوی دیوبندی تھے۔ جھوٹ ان علماء کا اسلحہ ہے۔ اس وقت ہندوستان میں انتخابات ہوئے تو انہوں نے شیعہ سیاست دانوں کو ووٹ دینا حرام قرار دیا۔ قائد اعظمؒ کے چودہ نکات اور گول میز کانفرنسوں کے نتیجے میں مسلم لیگ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت کے طور پر سامنے آ رہی تھی لیکن قائد اعظمؒ، ابوالحسن اصفہانی اور راجہ صاحب محمود آباد کے شیعہ ہونے کی وجہ سے مجلس احرار اور جمعیت علمائے ہند نے مسلم لیگ کے خلاف گھٹیا مہم چلائی۔ قائد اعظمؒ کی مرحومہ زوجہ رتی جناح، جنہوں نے شادی سے پہلے اسلام قبول کیا تھا اور جن کی وفات کے بعد ان کو شیعہ طریقے سے بمبئی کے خوجہ اثنا عشری قبرستان میں دفن کیا گیا تھا، کو جمعیت علمائے ہند نے کافرہ کہنا شروع کیا۔ مولانا حسین احمد مدنی نے **"سول میرج اور لیگ"** کے عنوان سے ایک پمفلٹ شائع کیا جس میں قائد اعظمؒ پر الزام لگایا کہ انہوں نے سول میرج ایکٹ کے مطابق ایک غیر مسلم عورت سے شادی کی تھی، جس کے جواب میں مسلم لیگ نے محترمہ رتی جناحؒ کے قبول اسلام کے ثبوت شائع کئے۔ یہ سب ایسے ماحول میں ہو رہا تھا جب کانگریس اور جمعیت کے کئی مسلم ممبران نے ہندو خواتین سے شادیاں کر رکھی تھیں۔ مثال کے طور پر جمعیت علمائے ہند کے رکن بیرسٹر آصف علی نے بنگالی ہندو خاتون، محترمہ ارونا، سے شادی کر رکھی تھی جو کبھی مسلمان نہ ہوئیں۔ ڈاکٹر خان صاحب نے ایک انگریز خاتون، جو علی الاعلان غیر مسلم تھیں، سے شادی کر رکھی تھی اور انکی بیٹی نے ایک سکھ لڑکے سے "سول میرج ایکٹ" کے تحت شادی کی تھی۔ وہ چونکہ کانگریس کے اتحادی تھے اسلئے مولانا مدنی نے انکی شادیوں پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ بعد ازاں جب مولانا آزاد کی زوجہ فوت ہوئیں تو مسلم لیگ کے نوجوانوں نے لوگوں کو ان کے جنازے میں شرکت سے باز رہنے کا کہہ کر اس توہین کا بدلہ لیا، یہ بھی ایک غیر اخلاقی حرکت تھی لیکن پھر بھی وہ کانگریسی علماء جتنے نہ گرے کہ کافرہ کہتے۔

[Abul Hassan Isphani, "**Quaid e Azam Jinnah, as I Knew Him**", Forward Publications Trust Karachi,(1967)]

مجلس احرار کے علماء نے ہی قائد اعظمؒ کو بھی کافر اعظم کہا۔ لیکن تحریک خلافت کے ڈسے ہوئے مسلمان عوام کی اکثریت پر ان علماء کی حماقت پوری طرح واضح تھی، وہ ان پر دوبارہ اعتماد کرنے کی غلطی نہیں کر سکتے تھے۔ برصغیر کے اکثر مذہبی علماء اسلئے اہمیت تو رکھتے ہیں کہ وہ احادیث اور فقہ کی پرانی کتابوں کے ماہر ہوتے ہیں، مگر ماضی قریب کی تاریخ، قانون، سیاست اور معیشت کے بارے میں انہوں نے باقاعدہ کوئی تعلیم حاصل نہیں کی ہوتی اور سیاست سے انکی آگاہی فقط اخبارات پڑھنے کی حد تک ہوتی ہے۔ اس وجہ سے سیاسی میدان میں انکی سوجھ بوجھ کسی ان پڑھ آدمی سے زیادہ

نہیں ہوتی۔ جمیعت علمائے ہند کیلئے یہ ہضم کرنا مشکل تھا کہ تحریک خلافت کے برعکس اس مرتبہ مسلمان **مسلم لیگ** کی طرف کھنچے جارہے تھے۔ 1937ء میں لکھنؤ کے شیعوں نے اشتعال انگیزی کے رد عمل میں تبرے کے جلوس نکالنا شروع کر دیئے۔ اس دوران **کانگریس** کی حکومت بن چکی تھی۔ 1938ء میں **جمیعت علمائے ہند** کے سربراہ مولانا حسین احمد مدنی نے مدح صحابہ بدعت کی قیادت سنبھال لی۔ 1938ء میں عاشورا کے موقعے پر شیعہ سنی جنگ ہوئی اور متعدد افراد قتل ہوئے۔ شہر کے شیعہ اور سنی شہریوں نے آپس میں بول چال، خریداری، آنا جانا بند کر دیا۔

قائداعظمؒ، جو کہ مسلمانوں کے حقوق کیلئے متحرک ہو چکے تھے، اس فساد کو کانگریس کی سازش سمجھتے تھے کیوں کہ اس کو ہوا دینے والے جمیعت علمائے ہند کے مولانا حسین احمد مدنی کانگریس کے اتحادی تھے۔ قائداعظمؒ کے خیال میں شیعہ سنی جھگڑے کروانے کا مقصد مسلم لیگ کی طرف سے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کیلئے شروع کی جانے والی تحریک کو پردے کے پیچھے دھکیلنا تھا۔ چونکہ مسلم لیگ کی قیادت ایک شیعہ وکیل کر رہا تھا اسلئے کانگریس بھی شیعہ سنی فساد سے امیدیں لگائے بیٹھی تھی، لیکن اسکو منہ کی کھانی پڑی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس زمانے میں کانگریسی وزیروں کی مسلم دشمنی سامنے آنے کے باوجود مولانا حسین احمد مدنی ہندو مسلم اتحاد کی تو وکالت کرتے تھے مگر مسلمانوں کا داخلی اتحاد توڑنے میں لگے رہتے تھے۔ اس تضاد کو حل کرنے کیلئے ہمیں مولانا مدنی کے معاشی مسائل کو سمجھنا ہوگا، مولانا کو دیوبند مدرسہ و جمیعت کا خرچہ پورا کرنا تھا۔ عوام سے چندہ لینے میں فرقہ وارانہ نفرت اور خوف بہت کارآمد ہے۔ دوسری طرف مسلم لیگ کے پروگرام کا مقابلہ نہ کر سکنے کی وجہ سے جمیعت علمائے ہند کی سیاسی زندگی ختم ہونے کو تھی، لہذا اسے ہندو مسلم بھائی بھائی کا نعرہ لگا کر کانگریس کے پروں میں پناہ لینا پڑی۔ گو یا رند کے رند رہے، ہاتھ سے جنت نہ گئی۔ 21 فروری 1940ء کو دہلی میں عزاداری کے جلوس پر بم سے حملہ کیا گیا۔ اس حملے کو عزاداری پر ہونے والا پہلا بم دھماکا کہا جاسکتا ہے۔ اس زمانے میں جلوسوں کی حفاظت کیلئے پولیس کی تعیناتی کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ پاکستان نہ بھی بنتا پھر بھی اس علاقے میں دہشتگردی جاری رہنا تھی۔ قیام پاکستان کے بعد ہجرت کر کے آنے والے اکثر فرقہ پرست علماء، مولانا سرفراز خان صفدر، مفتی محمود، مولانا منظور احمد چنیوٹی اور مولانا عبدالستار تونسوی وغیرہ انہی لوگوں کے شاگرد تھے۔

[N. Hollister, "**The Shia of India**", p-178, Luzac and Company Ltd, London,(1953)]

1940ء کی دہائی کی سیاسی گہما گہمی میں مسلمان عوام فسادی علماء سے دور ہو گئے لیکن جمیعت علمائے ہند اور مجلس احرار نے اپنے تئیں فرقہ وارانہ آگ لگانے کی کوششوں کو جاری رکھا۔ تحریک پاکستان کی عوامی مقبولیت میں اضافہ ہوا اور کانگریسی علماء کی فرقہ وارانہ تنگ نظری ان کے اپنے گلے پڑ گئی تو مجلس احرار اور جمیعت علمائے ہند نے مسلمان عوام کو

دھوکہ دینے کیلئے فرقہ وارانہ سرگرمیوں کو الگ نام سے جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ 1944ء میں لاہور کے نواحی قصبے امرتسر میں "**تنظیم اہل سنت**" کے نام سے ایک شیعہ مخالف دیوبندی جماعت کا قیام عمل میں لایا گیا۔ آگے چل کر اس جماعت نے کئی مرتبہ اپنی شناخت اور نام کو بدلا۔ 1946ء میں پنڈت نہرو کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے کابینہ مشن کی ناکامی اور قائد اعظمؒ کے "راست اقدام" کے بعد قیام پاکستان کو یقینی پا کر 26 اکتوبر 1946ء کو مولانا شبیر احمد عثمانی نے مسلم لیگ کے متوازی سیاسی جماعت "**جمعیت علمائے اسلام**" قائم کی۔ یوں ایک سرد جنگ شروع ہو گئی کیونکہ دیوبندی علماء قائد اعظمؒ کے جدید نظریات پر مبنی تصور پاکستان کو غلط سمجھتے تھے۔ پاکستان کے قیام سے پہلے ہی دیوبندی علماء نے شیعوں کی نماز جنازہ پڑھنے کو حرام قرار دے رکھا تھا اور مولانا شبیر احمد عثمانی بھی شیعوں کے لیے یہی سوچ رکھتے تھے۔ لہٰذا قائد اعظمؒ کی پہلی نماز جنازہ گورنر ہاؤس میں ان کے اپنے مسلک کے مطابق پڑھی گئی مگر جب عوام میں نماز جنازہ پڑھانے کی باری آئی تو حکومت نے مولانا شبیر احمد عثمانی کو طلب کیا تاکہ بعد میں جنازہ پڑھنے والوں کے خلاف کوئی فتویٰ نہ دے سکیں۔ اسکے باوجود "**فتاویٰ مفتی محمود**" میں شیعہ مسلمانوں کا جنازہ نہ پڑھنے کے فتووں ذیل میں قائد اعظمؒ کے شیعہ ہونے کی وجہ سے مولانا شبیر احمد عثمانی کی طرف سے ان کا جنازہ پڑھنے کو گناہ قرار دیا گیا ہے۔ دوسری طرف تنظیم اہل سنت کے مولانا نور الحسن بخاری، مولانا دوست محمد قریشی، مولانا عبد الستار تونسوی وغیرہ نے پاکستان بھر میں شیعہ مخالف جلسے کیے اور لوگوں کو فسادات کے لیے اکسایا۔ لہٰذا قیام پاکستان سے بعد ہی شیعوں پر حملے شروع ہو گئے۔ 1949ء میں چوٹی زیریں اور 1950ء میں نارووال میں عزاداری پر حملے ہوئے۔ 1951ء میں پنجاب اسمبلی کے الیکشن میں شیعہ امیدواروں کے خلاف فرقہ وارانہ بنیادوں پر مہم چلائی گئی اور انھیں کافر قرار دیا گیا۔ ستم ظریفی یہ کہ 24 جنوری 1951ء میں کراچی میں دیوبندی علماء نے پاکستان میں اسلام کے نفاذ کے لیے 22 نکات ترتیب دیئے اور اس جلسے میں عوام کو دھوکہ دینے کیلئے شیعہ علماء کو بھی شامل کیا گیا، لیکن زمینی حقائق کچھ اور ہی بتا رہے تھے۔ 1953ء میں قادیانیوں کے خلاف چلنے والی مہم میں بھی شیعہ علماء شامل کئے گئے۔

دو سالوں کے لیے دیوبندی علماء کی توجہ ختم نبوت کے معاملے پر مرکوز رہنے کی وجہ سے شیعوں پر کوئی حملہ نہ ہوا۔ شیعہ مخالف حملوں کا دوبارہ آغاز 1955ء میں ہوا جب پنجاب میں پچیس مقامات پر عزاداری کے جلوسوں اور امام بارگاہوں پر حملے کیے گئے جن میں سینکڑوں لوگ زخمی ہوئے۔ اسی سال کراچی میں ایک مولانا صاحب نے افواہ اڑائی کہ شیعہ ہر سال ایک سنی بچہ ذبح کر کے نیاز پکاتے ہیں، اس افواہ کے زیر اثر کراچی میں ایک بلتی امامبارگاہ پر حملہ ہوا اور بارہ افراد شدید زخمی ہو گئے۔ اسی دوران نصاب تعلیم میں شیخ احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ اور سید احمد بریلوی کی سوچ شامل کی گئی۔ پاکستان میں دہشتگردی مکتب دیوبند کی اس ہمہ جہت ثقافتی یلغار کا ایک حصہ ہے جو قیام پاکستان کے بعد ہی شروع ہو گئی تھی۔ 1957ء میں ملتان کے ضلع مظفر گڑھ کے گاؤں سیت پور میں محرم کے جلوس پر حملہ کر کے تین عزاداروں کو قتل کر دیا گیا۔ حکومت کی طرف سے عدالتی کمیشن قائم کیا گیا اور اس واردات میں ملوث پانچ دہشت گردوں کو سزائے موت دی گئی۔ اسی سال احمد پور شرقی میں عزاداری کے جلوس پر پتھراؤ کے نتیجے میں ایک شخص جان بحق اور تین شدید

زخمی ہوئے۔ جون 1958ء میں بھکر میں ایک شیعہ خطیب آغا محسنؒ کو قتل کر دیا گیا۔ قاتل نے اعترافی بیان میں کہا کہ مولانا نورالحسن بخاری کی تقریر نے اس کو اس جرم پر اکسایا تھا جس میں شیعوں کو قتل کرنے والے کو غازی علم دین شہید سے نسبت دی گئی تھی اور جنت کی بشارت دی گئی تھی۔ مولانا نورالحسن بخاری کو حکومت کی طرف سے کوئی سزا نہ ملی، جس سے فسادی علماء کی حوصلہ افزائی ہوئی۔

[Andreas Rieck, "**The Shias of Pakistan: An Assertive and Beleaguered Minority**", Oxford University Press,(2016)]

پاکستان کی ابتدائی تاریخ میں 1963ء کا سال سب سے زیادہ خونریز ثابت ہوا۔اسی سال جنرل ایوب نے مذہبی سیاسی جماعتوں کے بعض مطالبات تسلیم کئے تھے۔ 3جون 1963ء کو بھاٹی دروازہ لاہور میں عزاداری کے جلوس پر پتھروں اور چاقوؤں سے حملہ کیا گیا جس کے نتیجے میں دو عزادار قتل اور سو کے قریب زخمی ہوئے۔ نارووال، چنیوٹ اور کوئٹہ میں بھی عزاداروں پر حملے ہوئے۔ اس سال دہشت گردی کی بدترین واردات سندھ کے ضلع خیر پور کے گاؤں ”ٹھیری“ میں پیش آئی جہاں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق عاشورا کے دن 120 عزاداروں کو کلہاڑیوں اور تلواروں کی مدد سے ذبح کیا گیا۔ان جرائم میں ملوث افراد کو کوئی سزا نہ مل سکی۔

اس وقت تک شیعہ دشمنی میں اتنی شدت آچکی تھی کہ 11 جولائی 1967ء کو مادر ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ کے جنازے پر ایک شدت پسند گروہ نے پتھراؤ شروع کر دیا جس کے خلاف پولیس کو آنسو گیس کا استعمال کرنا پڑا۔ انکی پہلی نماز جنازہ ان کے اپنے مسلک، یعنی اثنا عشری شیعہ، کے مطابق ہوئی لیکن عوام میں سنی جنازہ پڑھانے کیلئے بڑی مشکل سے بدایونی نامی سنی عالم راضی ہوئے تھے۔ جنرل ایوب خان نے اپنی یادداشتوں میں اس ہنگامے کا ذکر کیا ہے۔ بات صرف قتل و غارت تک محدود نہیں تھی، نفرت پر مبنی لٹریچر کا تنور بھی دہک رہا تھا۔ آزادی سے پہلے مرزا حیرت دہلوی اور عبدالشکور فاروقی ک طرف سے لکھی گئی ی کتابیں کم تھیں کہ محمود احمد عباسی اور ابو یزید بٹ کی کتابوں نے اشتعال انگیزی کے سابقہ ریکارڈ توڑ دیئے۔ بعد میں مسلک اہل حدیث کے علامہ احسان الٰہی ظہیر نے جلتی پر مزید تیل چھڑکا۔ان لوگوں کی گندی زبان کا ردعمل اسی کی دہائی میں اس صورت میں آیا جب پنجاب کے ایک دیہاتی شیعہ مولوی غلام حسین نجفی نے مخصوص صحابہ کے بارے میں بھی ایسی ہی زبان استعمال کی۔

ساٹھ اور ستر کی دہائیوں کی اہم ترین پیشرفت سوشلزم کی لہر تھی جس نے عوام میں دیوبندی علماء کے اثر ورسوخ کو کم کیا ۔اسی وجہ سے 1965ء سے 1977ء تک کے عرصے میں شیعہ مخالف تشدد میں نمایاں کمی نظر آتی ہے۔ اگرچہ

تکفیری علماء نے نفرت انگیزی کی کوششوں میں کوئی کمی روا نہ رکھی تھی، لیکن اب عوام میں ان کا حلقۂ اثر محدود ہو گیا تھا۔

افغانستان نے 1973ء میں پشتونستان کے نام پر پاکستان کے پختونوں کو استعمال کر کے ملک توڑنے کی سازش بنائی جس کے جواب میں پاکستان نے افغان حکومت کے مخالف اخوان کو مدد دینا شروع کی تھی۔ اس طرح نام نہاد "افغان مجاہدین" کے ساتھ پاکستانی حکومت کے تعلقات 1974ء میں ہی استوار ہو گئے۔ جمعہ خان صوفی نے اپنی کتاب **"فریب ناتمام"** میں ان سب واقعات اور افغانستان کی پسماندگی کی تفصیل لکھی ہے۔ جب جولائی 1977ء میں جماعت اسلامی کی فکر سے متاثر جنرل ضیاء الحق نے مارشل لا نافذ کیا تو اگلے محرم، فروری 1978ء میں لاہور میں 8 جبکہ کراچی میں 14 شیعہ قتل ہوئے۔ جب بھی سیاسی فضا مذہبی سیاسی جماعتوں کے حق میں ہوئی، شیعہ کشی میں اضافہ ہوا ہے۔ پاکستان میں شیعہ مخالف تشدد میں شدت اس وقت آئی جب 27 اپریل 1978ء کو افغانستان میں **"انقلاب ثور"** آیا اور اس سے اگلے سال افغانستان کی کمیونسٹ حکومت نے روس کو مداخلت کی دعوت دی۔ اس اقدام کے نتیجے میں افغانستان غیر مستحکم ہو گیا۔ جب کوئی ریاست ٹوٹتی ہے تو وہ ڈاکوؤں اور دہشت گردوں کے لیے جنت بن جاتی ہے۔ انگریزوں کو ایک مرتبہ پھر اپنے دشمن سے لڑنے کیلئے سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل دہلوی جیسے کٹھ پتلی جہادیوں کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ افغانستان میں کمیونزم کا راستہ روکنے کیلئے امریکا کی دولت اور سرپرستی میں پاکستان نے افغان مجاہدین کو ٹریننگ، اسلحہ اور پناہ فراہم کرنا شروع کی۔ پختون قبائل میں پہلے ہی امیر عبدالرحمن خان کے زمانے سے شیعہ مخالف جذبات پائے جاتے تھے۔

اگلے سال فروری 1979ء میں ایران میں انقلاب آیا جس نے شیعہ مسلک کو عالمی سیاسی بساط پر متعارف کرایا۔ بات صرف ایرانی انقلاب کی قیادت کے شیعہ ہونے کی نہیں تھی، ایران کی مذہبی قیادت نے انقلاب کی کامیابی کے بعد ایران سے باہر سب سے پہلے جس شخصیت سے رابطہ کیا وہ مولانا مودودیؒ تھے۔ جماعت اسلامی کے قیام کے ابتدائی سالوں سے ہی دیوبندی علماء بالعموم اور مولانا منظور احمد چنیوٹی بالخصوص، مولانا مودودیؒ سے پیشہ وارانہ مخاصمت رکھتے تھے اور ان کے خلاف کئی مضامین اور کتابیں لکھ چکے تھے۔ انہوں نے **"ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت"** کے عنوان سے کتاب لکھ کر شیعہ سنی منافرت کو ہوا دی جس کے نتیجے میں جہاں جماعت اسلامی کی مقبولیت میں کمی آئی وہاں پاکستان میں شیعہ کشی میں مزید تیزی آئی۔

1984ء میں مولانا نور الحسن بخاری کی وفات کے بعد کچھ عرصہ "تنظیم اہلسنت" کی باقیات کو **"سواد اعظم"** پکارا گیا اور اسکی سرپرستی مولانا سمیع الحق نے کی۔ 1985ء میں یہ جماعت پاکستانی پنجاب کے شہر جھنگ میں **"انجمن سپاہ صحابہ"** کے نئے نام سے سامنے آئی۔ کچھ سالوں بعد جب اس نام کے انگریزی مخفف (ASS) کا مذاق اڑایا جانے لگا تو اسکا نام

بدل کر "**سپاہ صحابہ پاکستان**" رکھ دیا گیا۔ ضیاء کے زمانے میں کوئٹہ، کراچی، پنجاب، پشاور، پاراچنار، ڈیرہ اسماعیل خان اور گلگت میں شیعوں پر بڑے حملے ہوئے۔ اسی کی دہائی میں پاکستان بھر میں سات سو کے لگ بھگ شیعہ قتل ہوئے۔ ضیاء دور میں ہی تاریخی دستاویزات کو جھٹلا کر قائدِ اعظمؒ کو سنی کہلوانے کی کوششوں کا آغاز ہوا جس کے بعد سے اب تک کئی جعلی قصے گھڑے گئے ہیں۔ جن لوگوں سے یہ قصے منسوب کئے جاتے ہیں انہوں نے کبھی قائد کی زندگی میں ان کے خلاف شیعہ دشمنی پر مبنی پروپیگنڈے کے رد میں یہ نہیں کہا کہ قائد تو سنی ہیں۔ قائد نے بھی کبھی اپنے شیعہ ہونے سے انکار نہیں کیا، اور اپنے ذاتی معاملات، جیسے نکاح، تدفین اور وراثت وغیرہ، میں علی الاعلان فقہ جعفریہ کو اختیار کیا۔ جس ماحول میں تنگ نظری کی وجہ سے بانیٔ پاکستان کا شیعہ ہونا بھی ہضم نہ کیا جا رہا ہو وہاں عام شیعہ افراد کا ثانوی شہری بن جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اسی دور میں سرکاری ملازمتیں متعصب افراد کے سپرد کی گئیں۔ سکولوں میں اسلامیات کے تکفیری اساتذہ بچوں کا ذہن خراب کرنے لگے، اس ذہن سازی نے آگے چل کر طالبان کو مدارس کے علاوہ سرکاری تعلیمی اداروں سے بھی افرادی قوت فراہم کی۔ عدالتوں میں متعصب جج بھرتی کئے گئے۔ یہاں ایک اہم نکتے کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ مارشل لاء لگنے کے بعد جنرل ضیاء اور ذوالفقار علی بھٹو ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے تھے، لیکن سیاسی طور پر ضیاء الحق بھٹو صاحب کے پیرو تھے۔ مخالف سیاسی کارکنان کا قتل ہو، ذاتی مفاد کیلئے اسلام کا استعمال ہو یا افغانستان میں کردار، یہ بھٹو صاحب کی ہی حکمت عملی تھی۔ تاریخ سے واقف لوگ جانتے ہیں کہ جنرل ضیاء نے بھٹو صاحب کے طرز حکومت کو ہی جاری رکھا ہے۔ پاکستان میں حکومتوں کی نااہلی کا شیعوں کو نقصان اٹھانا پڑا ہے لیکن کوئی بھی حکومت شیعہ دشمن نہیں تھی۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بعض تکفیری سرکاری افسروں نے شیعہ عوام کے حقوق کے سلسلے میں اپنے عہدے سے خیانت کا مظاہرہ کیا ہے۔

جس وقت روس افغانستان سے نکلا اسی وقت مقبوضہ کشمیر میں بھارتی مظالم سے تنگ عوام نے احتجاجی مظاہروں کا آغاز کر دیا۔ پاکستان کی انتظامیہ نے افغان جہاد کے بچے ہوئے جہادیوں کو کشمیر میں استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن ان جہادیوں نے کشمیر جا کر مقامی آبادی کو بدعتی سمجھا، مزارات پر حملے کیے اور بریلوی اور شیعہ کشمیریوں کے گھروں میں لوٹ مار کی۔ جہاد کشمیر کے نام پر جیش محمد کے مولانا مسعود اظہر لڑکوں کو بھرتی کر کے ٹریننگ دیتے اور مولانا اعظم طارق اور مولانا ضیاء الرحمن فاروقی ان کو شیعہ کشی کا راستہ دکھاتے۔ بعد ازاں کشمیر جہاد وہاں کی مقامی آبادی کے جہادیوں سے خوفزدہ ہو جانے کی وجہ سے ناکام ہو گیا۔ تاریخ کا سبق ہے کہ آزادی کی کوئی بھی تحریک باہر سے سمگل شدہ جنگجوؤں کے بل بوتے پر کامیاب نہیں ہوتی۔ چی گویرا جیسے عالمی شہرت یافتہ انقلابی کے آخری ایام اس بات پر گواہ ہیں۔ افغان طالبان نے پاکستان میں دیوبندی انقلاب لانے کی غرض سے دیوبندی تنظیموں کے کارکنان کو فراخدلی سے پناہ اور ٹریننگ فراہم کی۔ پاکستان میں شیعہ قتل کر کے یہ لوگ افغانستان بھاگ جاتے۔ ملک کے کئی نامور ڈاکٹر، انجنیئر اور قانون دان محض شیعہ ہونے کی وجہ سے قتل کر دیئے گئے۔ انکی عورتیں بیوہ، والدین بے سہارا اور بچے یتیم ہو گئے۔ نوے کی دہائی میں ہی

کراچی میں سپاہ صحابہ اور جماعت اسلامی کی طرف سے بریلوی مساجد پر قبضے کے خلاف سنی تحریک کے نام سے ایک اور مزاحمتی گروہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ چنانچہ تکفیری علماء نے اب بریلویوں پر قاتلانہ حملے کرنے کا آغاز کر دیا۔ بریلویوں پر پہلا نمایاں حملہ 2001ء میں ہوا جب سنی تحریک کے بانی جناب سلیم قادریؒ کو کراچی میں قتل کر دیا گیا۔اسی دوران سپاہ صحابہ کی طرف سے دیگر مذاہب کے ماننے والوں پر بھی حملے شروع ہوئے۔ مثال کے طور پر اکتوبر 2001ء میں سپاہ صحابہ کے چھ کارکنان نے بہاولپور میں سینٹ ڈومینک چرچ میں فائرنگ کر کے اٹھارہ نہتے اور بے گناہ مسیحیوں کو قتل کر دیا۔

اکیسویں صدی کا آغاز خود کش دھماکوں سے ہوا۔ 7 اکتوبر 2001ء کو امریکا نے افغان طالبان پر حملہ کر دیا۔ پاکستان کی حکومت نے پرائی جنگ اپنے سر لینے کے بجائے امریکا کو راستہ دینے کا فیصلہ کیا۔ مفتی نظام الدین شامزئی نے ملک گیر بغاوت پر اکساتے ہوئے فتویٰ جاری کیا۔ مفتی شامزئی سوات سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے فتوے کو قبائلی علاقہ جات میں بہت پذیرائی ملی۔ آج بھی یہی فتویٰ تحریک طالبان پاکستان کی طرف سے پاکستان مخالف جنگ کے شرعی جواز کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ پنجاب اور سندھ میں دیوبندی مدارس کے پاس اتنا اسلحہ اور افرادی قوت نہیں تھی کہ وہ پولیس اور فوج سے لڑ سکتے، لہٰذا ان علاقوں پر اس فتوے کا فوری اثر نہ ہو سکا۔ افغان طالبان چند دنوں میں امریکا کے ہاتھوں شکست کھا گئے اور بہت سے طالبان اور القاعدہ کے جنگجو برقعے پہن کر پاکستانی علاقوں میں آ گئے۔ امریکا نے پاکستان سے مطالبہ کیا کہ یا تو القاعدہ کے ان فراری ارکان کو خود گرفتار کر کے امریکا کے حوالے کرے یا امریکی مداخلت کا انتظار کرے۔ 2004ء میں پاکستانی فوج نے قبائلی علاقہ جات میں ان فراری طالبان کی گرفتاری کے لیے آپریشن شروع کیا تو پاکستان بھر کے دیوبندی علماء کی طرف سے فتاویٰ اور احتجاج کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ادھر سن 2002ء کے الیکشن میں خیبر پختون خواہ کی صوبائی حکومت اور کراچی کی شہری حکومت **متحدہ مجلس عمل** نامی مذہبی جماعتوں کے اتحاد کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ ان حکومتوں نے سرکاری نوکریاں متعصب افراد کو دیں جو دہشت گردی کی کاروائیوں میں طالبان کے سہولت کار بنے۔ ہمیشہ کی طرح متحدہ مجلس عمل میں شیعہ علماء بھی شریک کئے گئے تھے۔

اہل تشیع کے خلاف کینہ رکھنے کے باوجود ان کے علماء کو دیوبندی اسلام کے نفاذ کیلئے استعمال کرنے کی چال کی وضاحت معروف تکفیری دیوبندی مولانا زاہد الراشدی ان الفاظ میں کرتے ہیں:-

"یہ دراصل سیکولر حلقوں کے اس اعتراض یا الزام کا عملی جواب ہے کہ پاکستان کے اسلامی تشخص، ملک میں اسلام اور شریعت کی حکمرانی کے بارے میں ملک کے مذہبی مکاتب فکر پوری طرح متفق اور پاکستان میں نفاذ اسلام فرقہ وارانہ مسئلہ نہیں بلکہ متفقہ قومی مسئلہ ہے۔ ایک موقع پر بعض دوستوں نے یہ سوال کیا ہے کہ ہمارے والد محترم امام اہل سنت

حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کا موقف اور طرز عمل کیا تھا؟ خصوصاً اس پس منظر میں کہ انہوں نے اثناء عشری اہل تشیع کی تکفیر پر "**ارشاد الشیعہ**" کے نام سے کتاب بھی لکھی ہے، میں نے گزارش کی کہ انہوں نے "ارشاد الشیعہ" تصنیف فرمائی اور اس میں انہوں نے جو موقف اختیار کیا ہے وہ صرف ان کا موقف نہیں بلکہ یہ تو اہل سنت کا موقف ہے اور خود ہمارا موقف بھی اثنا عشری اہل تشیع کی حد تک یہی ہے، لیکن اس کے باوجود وہ ان تمام تحریکات کا حصہ رہے ہیں[مولانا زاہد الراشدی،"قومی وملی تحریکات میں اہل تشیع کی شمولیت "، [http://zahidrashdi.org/129]۔

یہ پورا مضمون پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ دیوبندی اکابر کی تحریروں سے یہ سمجھنا کوئی مشکل نہیں کہ جوں جوں ان تحریکات کو کامیابی ملے گی توں توں شیعوں پر عرصۂ حیات تنگ ہوتا جائے گا، اور ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ بدقسمتی سے شیعہ اکابر بھی اتحاد بین المسلمین کا مطلب اس قسم کی فرقہ پرست جماعتوں سے اتحاد کو سمجھتے رہے۔ حالانکہ الیکشن جیتنے والی بڑی سیاسی جماعتیں ہی اکثر پاکستانی مسلمانوں کی نمائندہ ہیں، اور ان سے اتحاد ہی اتحاد بین المسلمین کہلا سکتا ہے۔ شیعہ علماء کے ان نام نہاد دینی اتحادوں میں شامل ہونے کی وجہ وہی ہے جو فلسطین کی تنظیم الفتح کے سربراہ یاسر عرفات کے اوسلو معاہدے پر دستخط کرنے کی وجہ تھی۔ اوسلو معاہدے نے فلسطینی عوام پر ظلم میں تو اضافہ کیا لیکن الفتح کو "فلسطینی اتھارٹی" نامی ادارہ قائم کرنے اور اس کیلئے امریکا اور یوروپی ممالک سے ہر سال بجٹ حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔ اس سے پہلے جمعیت علمائے ہند کے کانگریس کے ساتھ اتحاد میں کارفرما معاشی مسائل کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ متحدہ مجلس عمل کی صوبائی حکومت نے بھی شیعہ علماء کو ماہانہ لاکھوں روپے کی تنخواہ کے ساتھ مشیر اور نائب صدر وغیرہ کے عہدے دیئے تھے، جس سے انکا معیار زندگی بھی امیر لوگوں جیسا ہو گیا۔ یہ آئندہ بھی ایسے کسی بندوبست میں شامل ہونے سے نہیں ہچکچائیں گے۔

مفتی شامزئی کے فتوے کی وجہ سے پاکستان بھر سے دہشتگرد اب قبائلی علاقوں میں جمع ہو کر تحریک طالبان پاکستان نامی ایک منی سٹیٹ قائم کر چکے تھے۔ ان طالبان نے پاکستانی فوج پر پے در پے حملے شروع کر دیئے۔ حکومت نے ان طالبان کو رام کرنے کی غرض سے متعدد امن معاہدے کئے مگر وہ سب طالبان کو مزید مضبوط کرنے پر منتج ہوئے۔ اسلام آباد میں لال مسجد ان مساجد میں سے تھی جو شدت پسندی کا مرکز سمجھی جاتی ہیں۔ وہاں کے مولانا عبدالعزیز نے حکومت کو کمزور پڑتا دیکھ کر دیوبندی مسلک کی تشریح کے مطابق شریعت کے نفاذ کا مطالبہ کیا اور شہر میں کاروائیاں شروع کر دیں۔ 3 جولائی 2007 کو حکومت نے لال مسجد کے خلاف آپریشن شروع کر دیا۔ خواتین اور بچوں کو باہر جانے کی اجازت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مولانا عبدالعزیز بھی ایک خاتون کا برقعہ پہن کر نکل گئے۔ بعد میں چیف جسٹس پاکستان

افتخار محمد چوہدری کی سربراہی میں بننے والے تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ کے مطابق اس آپریشن میں نوے کے قریب مسلح جنگجوؤں کو قتل کر دیا گیا تھا۔

پاکستانی حکومت نے جان لیا تھا کہ طالبان سے مذاکرات اور معاہدے کرنا کسی قسم کا کوئی فائدہ نہیں دے گا۔ ادھر طالبان روز بروز طاقتور ہوتے جا رہے تھے۔ طالبان اب کمزور طبقات سے آگے بڑھ کر پورے ملک کو خوفزدہ کر کے سرنڈر کروانا چاہتے تھے۔ طالبان کے خیال میں اب زندگی کے تمام شعبہ جات کو اپنے نظریات کے مطابق ڈھالنے کا وقت آن پہنچا تھا۔ پاکستانی کی سیاسی قیادت، میلے اور کھیل کے میدان، تعلیمی ادارے، پولیو مہم اور صحت عامہ کے دیگر منصوبے، صوفیا کے مزارات، بری فوج اور فضائیہ و بحریہ، عدلیہ و پولیس، غرض قومی زندگی کا ہر شعبہ دہشت گردی کے نشانے پر تھا۔ 11 اپریل 2006 کو نشتر پارک میں دھماکہ کر کے سنی تحریک کے قائدین سمیت 47 لوگ شہید کر دیئے گئے۔ 12 جون 2009 کو لاہور میں مفتی سرفراز نعیمی کو خودکش بمبار کی مدد سے شہید کر دیا گیا۔ 27 دسمبر 2007 کو راولپنڈی میں محترمہ بے نظیر بھٹو کو قتل کر کے پیپلز پارٹی کی کمر توڑ دی گئی جس سے انتخابات میں اس جماعت کی کارکردگی متاثر ہوئی۔ ان کے خلا نے آنے والے دنوں میں پاکستان پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ 2013 کے انتخابات میں پیپلز پارٹی اور عوامی نیشنل پارٹی کے جلسوں پر دھماکے کر کے انکی عوامی رابطہ مہم کو نقصان پہنچایا گیا۔ 3 مارچ 2009 کو لاہور میں سری لنکا کی کرکٹ ٹیم پر حملہ کر کے پاکستان میں کھیلوں کے بین الاقوامی مقابلوں کا خاتمہ کیا گیا۔ 10 اکتوبر 2009 کو جی ایچ کیو میں ملٹری انٹیلی جنس کے ہیڈ کوارٹر پر حملہ کر کے فوج کے اعلیٰ افسران سمیت 55 افراد کو قتل کیا گیا۔ 2 جولائی 2010 کو لاہور میں داتا دربار پر حملہ کر کے پچاس افراد کو قتل اور دو سو کو شدید زخمی کر دیا گیا۔ 22 مئی 2011 کو کراچی میں بحریہ کے مہران ائیر بیس پر حملہ کر کے اٹھارہ اہلکاروں کو قتل اور دو جاسوسی طیاروں کو تباہ کیا گیا۔ 16 اگست 2012 کو کامرہ اور 18 ستمبر 2015 کو بڈھ بیر کے مقام پر پاک فضائیہ کے اڈوں پر حملہ کیا گیا جن میں بالترتیب 2 اور 29 اہلکاروں کو قتل کیا۔ 20 اکتوبر 2009 کو اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد، 16 دسمبر 2015 کو آرمی پبلک اسکول پشاور اور 20 جنوری 2016 کو باچا خان یونیورسٹی چارسدہ پر حملے تعلیمی اداروں پر حملوں کی نمایاں مثالیں ہیں۔ 9 اکتوبر 2012 کو معروف عالمی شخصیت ملالہ یوسفزئی پر قاتلانہ حملہ ہوا جس سے ان کے گال کا دایاں حصہ ہمیشہ کیلئے فالج زدہ ہو گیا۔ مارچ 2014 کو اسلام آباد کی ضلعی عدالت اور 8 اگست 2016 کو کوئٹہ میں وکلا کے اجتماع پر حملہ ہوا۔ 24 اکتوبر 2016 کو کوئٹہ میں پولیس کے ٹریننگ سینٹر پر حملہ کر کے 61 نوجوانوں کی لاشیں ان کے والدین کے پاس پہنچائی گئیں۔ یہاں اختصار کے پیش نظر تمام خودکش حملوں اور ان کے محرکات اور اثرات کا تفصیل سے تذکرہ نہیں کیا جا سکتا۔ سید احمد بریلوی کے پیروکار مفتی نور ولی نے **"انقلاب محسود"** کے عنوان سے کتاب لکھ کر ان حملوں کی تفصیلات کو جمع کیا ہے۔ یہ چیدہ چیدہ مثالیں یہ نکتہ واضح کیلئے کافی ہیں کہ انگریزوں کے

جانے کے بعد مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا نور الحسن دیوبندی، مولانا عبدالستار دیوبندی اور مولانا مودودی جیسے علماء کی طرف سے شروع کئے گئے فسطائی سلسلے کو تاریخ کے علم کی روشنی میں نہ سمجھنے اور غیر ذمہ دارانہ کردار نے معاشرے کو کس دلدل میں پہنچا دیا ہے؟ تاریخ چیونٹی کی رفتار سے آگے بڑھتی ہے اور تاریخ کا شعور نہ رکھنے والے لوگ اپنے معاشرے کے اس ارتقا سے ناواقف رہتے ہیں۔

دوسری طرف اعداد و شمار کے مطابق قیام پاکستان سے اب تک تقریبا تیس ہزار شیعہ قتل ہوئے جبکہ ہزاروں زخمی، معذور یا نفسیاتی دھچکے کا شکار ہو کر زندہ لاش بن چکے ہیں۔ عراق اور شام میں شکست کے بعد داعش کی نظریں پاکستان کے ایٹمی اثاثوں پر ہیں۔ اب تاریخ کو سمجھنے اور پروپیگنڈے کا مقابلہ کرنے کا وقت ہے۔

اعداد و شمار کے مطابق پاکستان کی آبادی گزشتہ ستر برس میں چار کروڑ سے بڑھ کر بیس کروڑ ہو چکی ہے۔ اسی فیصد آبادی غریب اور چالیس فیصد آبادی خواندہ یا نیم خواندہ ہے۔ ورلڈ بنک کی حالیہ رپورٹ کے مطابق چالیس فیصد پاکستانی بچے خوراک کی کمی سے دوچار ہیں۔ پانچ سال کی عمر تک دودھ، گوشت، پھلوں اور گھی کی کمی اور بار بار مریض ہونے سے ان بچوں کا دماغ کمزور ہو جاتا ہے اور وہ منطقی انداز فکر کے قابل نہیں رہتے، چاہے اعلیٰ تعلیمی اداروں تک پہنچ بھی جائیں۔ دیوبندی مدارس میں طلبہ کی تعداد تیس لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے۔ شیعہ مدارس میں طلبہ کی تعداد پچاس ہزار اور بریلوی مدارس میں دو لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ اس طرح تقریبا دو فیصد آبادی ذہنی طور پر پانچ سو سال پرانے نصاب تعلیم میں پھنسی ہوئی ہے۔ پاکستان کی آبادی کا بیس فیصد دیوبندی، بیس فیصد شیعہ، پچاس فیصد بریلوی، دو فیصد اہل حدیث اور باقی غیر مسلم ہیں۔ آج تک ہونے والی دہشتگردی کی وارداتوں میں دیوبندی تنظیموں کے علاوہ اردو لسان پرست، پختون، بلوچ اور سندھی قوم پرست، نیز سپاہ محمد اور سنی تحریک بھی شامل رہے ہیں۔ تمام خودکش دھماکے دیوبندی تنظیموں نے کئے، ان میں سے نوے فیصد دھماکوں میں پختون دیوبندی ملوث تھے۔ دیوبندی مسلک سے تعلق رکھنے والی معروف دہشتگرد تنظیموں کے نام یہ ہیں: تحریک طالبان پاکستان، اہلسنت والجماعت پاکستان، لشکر جھنگوی پاکستان، تحریک نفاذ شریعت محمدی، حرکت الانصار، جند اللہ، جیش محمد، حرکت الجہاد الاسلامی، تحریک المجاہدین، لشکر عمر، وغیرہ۔ عرب ممالک میں داعش، القاعدہ اور حزب التحریر میں زیادہ تر سلفی دہشتگرد شامل ہوتے ہیں، لیکن پاکستان اور افغانستان میں ان تنظیموں کے کارکنوں کی اکثریت دیوبندی مسلک یا جماعت اسلامی سے تعلق رکھتی ہے۔

رائے عامہ کے محاذ پر پہلے دہشتگردی کو ڈرون کا ردعمل وغیرہ کہہ کر عوام کی توجہ کو منتشر کیا جاتا رہا۔ اب جب آرمی پبلک سکول کے قتل عام کے بعد پاکستانی عوام تکفیری دہشتگردی کے خلاف اکٹھے ہو گئے تو اوریا مقبول جان وغیرہ نے مولانا خادم رضوی کو ڈھال بنالیا ہے تاکہ عوام ان پر وار کرتے رہیں اور دو سو سال سے جاری دہشتگردی کے اصل مراکز کی طرف سے انکی توجہ ہٹ جائے۔ زمانے کے حالات سے ناواقف مولانا خادم رضوی اس وقت حزب التحریر اور اخوان

المسلمون کی بولی بول رہے ہیں۔ دوسری طرف طالبان بھی اسی مقصد کی خاطر پی ٹی ایم کی شکل میں "دہشتگردی کے پیچھے وردی ہے" کا پروپیگنڈہ کرنے لگے، کیونکہ سید احمد بریلوی کے وارثوں سے مقابلے کیلئے پاکستانیوں کے پاس فوج کے سوا کچھ نہیں ہے۔ فوج کے خلاف بڑی آزادی اور جُرأت سے نعرے لگتے ہیں، سوشل میڈیا پر لکھا جاتا ہے۔ لیکن آج تک پی ٹی ایم نے کسی جلسے میں مفتی شامزئی، اسامہ بن لادن، مولانا سمیع الحق یا سید احمد بریلوی پر سرعام لعنت نہیں بھیجی۔ بہر حال پاکستانی قوم اب دہشتگردی کو انجام تک پہنچا کر دم لے گی، چاہے سو سال آپریشن کرنا پڑے۔ دہشتگردوں کے ساتھیوں کو سری لنکا کے تامل باغیوں کی تاریخ نہیں بھولنی چاہیئے۔

ہمیں چاہیئے کہ پاکستان میں انقلاب کی مخالفت کریں۔ پاکستان فرانس، روس، چین، ویتنام، کیوبا یا ایران کی طرح یک ثقافتی ملک نہیں ہے۔ پاکستان میں شام اور افغانستان کی طرح بہت سی نسلیں، بہت سے فرقے، بہت سے مذاہب اور سولہ مختلف مادری زبانیں پائی جاتی ہیں۔ انقلاب موجودہ ریاست کو اکھاڑ تو لے گا مگر اسکی جگہ نئی ریاست قائم نہیں کر سکے گا۔ ایسی صورت میں ہندوستان اور افغانستان دریائے سندھ پر ملنے کی کوشش کریں گے۔ افغان نژاد پرست احمد شاہ ابدالی کے دور کو واپس لانا چاہتے ہیں۔ پاکستان میں بہتری انقلاب کے بجائے موجودہ نظام میں اصلاحات لا کر ہی لائی جا سکتی ہے۔

یہ بھی لازم ہے کہ ہم سیکولرازم کو سمجھنے کی کوشش کریں، سیکولرازم سے مراد دین اور سیاست کی جدائی نہیں بلکہ دینی رہنماؤں اور سیاسی رہنماؤں کو الگ رکھنا ہے کیونکہ یہ زمانہ تخصص کا زمانہ ہے۔ پہلے دینی علماء حکیم بھی ہوا کرتے تھے لیکن اب علوم کی ترقی کی وجہ سے مذہبی علماء سے ڈاکٹرز کا کام نہیں لیا جاتا۔ جدید دور میں سیکولرازم ہی بہترین سیاسی نظام ہے۔ مطالعات کو وسعت دے کر مغل شہنشاہ اکبر اعظمؒ اور قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کے بارے میں مشہور کی گئی غلط فہمیوں کو دور کریں۔ تاریخ کی صحیح تفہیم کے بغیر مستقبل کی راہیں روشن نہیں کی جا سکتیں۔

تکمیل بمورخہ 14 اگست، 2018ء